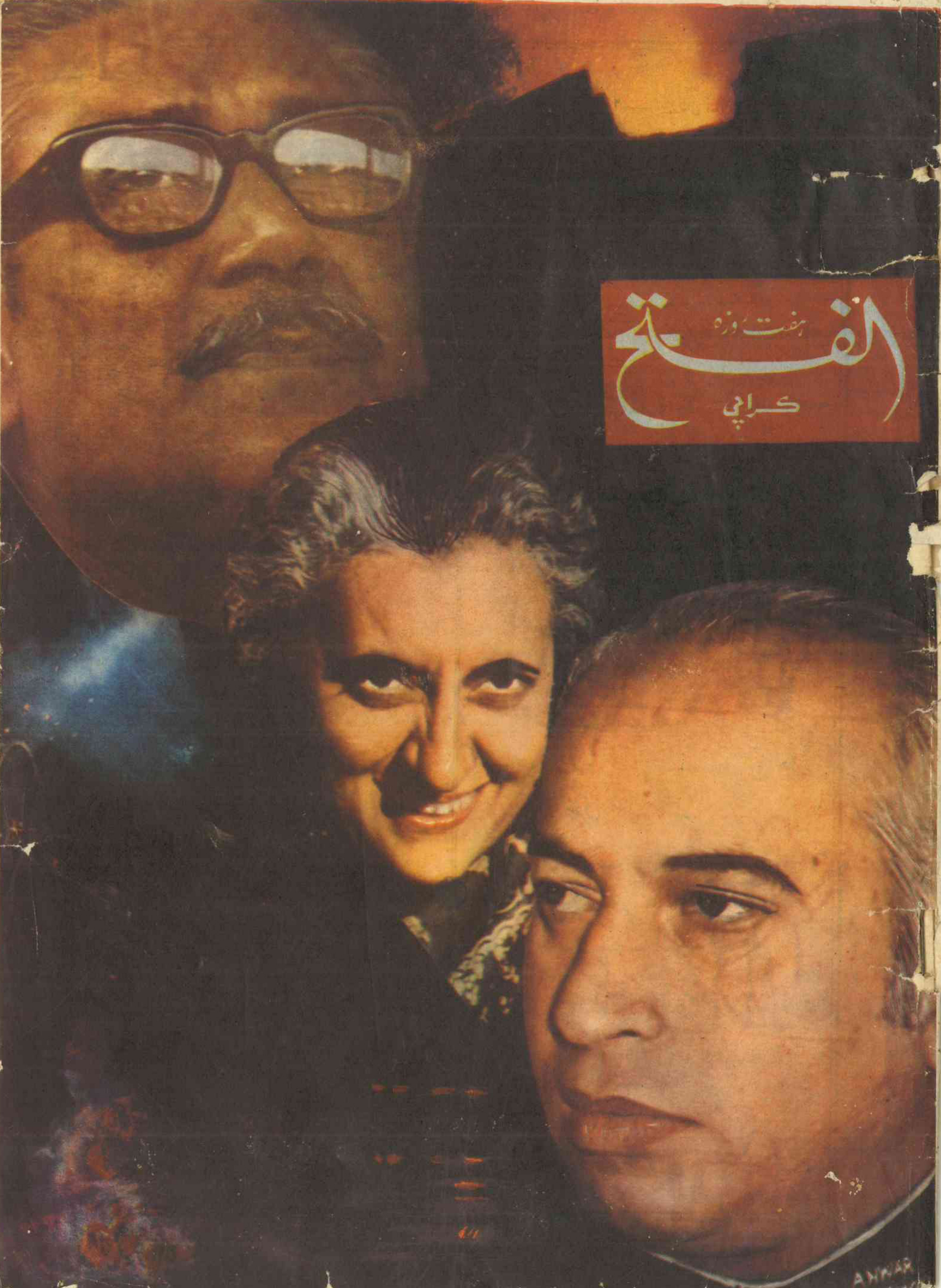


ہفت روزہ

الفتح

کراچی

دھرتی بولی

حسین رفیق

تیری بانہیں خالی خالی
تیری آنکھیں ویراں ویراں
تیری دنیا اجڑی اجڑی
ان سے پیار کی بھیک نہ مانگ
یہ کیا ڈالیں گے تیرے دامن میں پیار کے پھول
ان کی دنیا میں اُڑتی ہے مایوسی کی دھول
یہ انسان گھسٹتی لاشیں
ان کی آنکھیں پتھر آنکھیں
ان کے دل احساس سے خالی
یہ کیا دیں گے، یہ بدقسمت
مل جائے تو قسمت ان کی
چھن جائے تو قسمت ان کی
ان کی عزت، قسمت ان کی!
ان کی ذلت، قسمت ان کی
صدیوں سے قسمت کی دیمک
چاٹ رہی ہے ان کی ہمت
ان سے پیار کی بھیک نہ مانگ
تو ہرگز مایوس نہ ہونا
تو ہے ہر دورِ نو کا حاکم
تیری قسمت

عزم و عمل سے
جد و جہد سے
دورِ نو محنت کش کا ہے
محنت کش کا
عزم جواں ہے
فکر جواں ہے
وقت رواں ہے
تیری قسمت تیرا بازو
تنہا کب ہے تیرا بازو
تیرے کتنے سارے بازو
پیارے بازو
مشرق مشرق، مغرب مغرب
پھیل گئے ہیں
راج کریں گے
تیرے بازو ــــ تیری بانہیں
تیری بانہیں محنت محنت
تیری آنکھیں روشن روشن
تیری دنیا راحت راحت
دکھ کی برف پگھلنے کو ہے
سُکھ کی دھوپ نکلنے کو ہے

خداکی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد: ۳ —— شمارہ ۸

۶-۱۳ جولائی ۱۹۷۲

نگران
شوکت صدیقی

مدیر
ارشاد راؤ

نائب مدیر
وہاب صدیقی

سرورق :- انور سمیع

بدل اشتراک

	فی پرچہ	سالانہ	سہ ماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے:	۵۰ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت :- ۶۰ فلس دوبئی، قطر: ۵، درم

سعودی عرب :- ۵ قرش۔ انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت

ہفت روزہ "الفتح" ۷-۸ ڈی نرسری کمرشل ایریا

پی ای سی ایچ ایس — کراچی-۲۹

ایڈیٹر پبلشر: ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد۔ کراچی

ٹیلیفون: ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

پہلا راؤنڈ

صدر بھٹو اور مسز اندرا گاندھی کے درمیان مذاکرات کا پہلا راؤنڈ ختم ہو گیا ہے۔ بھارتی توسیع پسندوں نے مذکورہ مذاکرات میں خوب داؤ پیچ دکھائے ہیں، صدر بھٹو نے یقیناً کسی ایسی تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا ہے جو پاکستان کے عوام کو قبول نہیں۔ ان میں کشمیر، بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے اور بین الاقوامی سرحدوں میں ردّ و بدل سے متعلق بھارتی شرائط شامل ہیں۔

مذاکرات پھر ستمبر میں ہوں گے۔ مذاکرات کا ایک مسلمہ اصول یہ ہے کہ "کچھ دو اور کچھ لو"! بھارت کے عزائم کوئی ڈھکے چھپے نہیں، وہ پورا پاکستان لینا چاہتا ہے اور اس میں اسے روسی سوشل سامراجیوں اور امریکی سامراجیوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے راؤنڈ میں بھارتی حکمرانوں کا رویّہ مصالحانہ نہ تھا بلکہ ایک فاتح، مفتوح سے مخاطب تھا "تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جانے ہے"۔

مذاکرات ہوتے رہیں گے، ان کے بدلے میں ہمیں یقیناً کچھ دینا پڑے گا۔ فیصلہ یہ کرنا ہوگا کہ ہم اس احساس کا شکار کب تک رہیں گے کہ ہم ایک چھوٹی قوم ہیں، کمزور ہیں، لہٰذا بھارت جیسی بڑی قوم اور اس کی پشت پناہی کرنے والی عظیم طاقتوں سے تصادم کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہ احساس ملک کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے ہمیں زندہ رہنا ہے تو اس احساس کو عملی طور پر ختم کرکے عوام میں یہ شعور اور حوصلہ پیدا کرنا ہوگا کہ ہم سے بڑی قوم دنیا میں کوئی نہیں اور ہم عظیم ترین طاقت ہیں۔

یہ شعور مولانا کوثر نیازی کی وزارتِ اطلاعات و نشریات کے بھونڈے پراپیگنڈے سے پیدا نہ ہوگا بلکہ اس کے لیے ویت نامیوں کی طرح پاکستان کو مسلّح کرنا ہوگا عوامی فوج تیار کرنا ہوگی۔ ہر مرد اور ہر عورت کو مسلّح فوجی تربیت سے لیس ہونا پڑے گا۔ انہیں گوریلا جنگ کی تربیت دینا ہو گی۔ جب تک قوم کا ہر شہری مسلّح نہ ہوگا ہم ذلیل و رسوا ہوتے رہیں گے۔ بھارتیا اور روس نے ہماری اسی کمزوری کی وجہ سے اپنا بنگلہ دیش قائم کر دیا ہے اور اب ہمیں اسے تسلیم کرنے کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔

پاکستانی قوم بنگلہ دیش تسلیم نہیں کرے گی۔ جارحیت سے جنم لینے والی نام نہاد آزادی کو پاکستانی عوام قبول نہیں کر سکتے۔ یہی آزادی پھر پاکستان کے دوسرے حصوں پر مسلّط کی جا سکتی ہے۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مطلب پھر پاکستان کے کسی اور حصّے پر بھارتیوں اور روسیوں کو مزید جارحیت کی دعوت دینا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ صدر بھٹو اپنے اس قول پر قائم رہیں —— "پاکستان بھارتی جارحیت کا شکار ہوا ہے۔ مشرقی پاکستان کے مزدور کسان علیحدگی پسند نہیں بلکہ ایک پاکستان پر یقین رکھتے ہیں۔" صدر بھٹو پورے پاکستان کے سربراہ

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں

نیپ کی مزدور دشمنی

بورژوا سیاسی جماعتوں نے مزدور تحریک کو تباہ کیا

عثمانی — ! ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ

وہاب صدیقی

مزدوروں نے شہید چوک بنارس کالونی میں نیپ کا جلسہ نہیں ہونے دیا۔ اس طرح ان جیالے محنت کشوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنی تحریک کو کسی سیاسی جماعت کے بورژوا ہتھکنڈوں کی بھینٹ چڑھنے نہیں دیں گے۔ نہ ہی شہیدوں کے بہنے والے خون سے نیپ کو سیاسی فائدہ اٹھانے کا موقع دیں گے۔ یہ ان کی اپنی تحریک ہے، مزدوروں کی طبقاتی جدوجہد، پاکستان اور دنیا بھر کی پرولتاری تحریک کا ایک جاندار حصہ ہے۔

کراچی کے مزدوروں کی یہ جدوجہد اس لحاظ سے بھی ایک نمایاں اہمیت کی حامل ہے کہ دس روزہ ہڑتال کے دوران اس تحریک کی قیادت مکمل طور پر مزدوروں کے ہاتھوں میں رہی۔ مزدور قیادت نے کسی بھی سیاسی پارٹی کو اپنی صفوں میں گھس کر اس سے سیاسی فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔ جہاں تک سماج کے مختلف طبقات کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا تعلق ہے تو مزدوروں نے اس موقع کو ضائع جانے نہ دیا۔ ان کی جدوجہد کو سماج کے پسے ہوئے مظلوم طبقات کی پوری پوری ہمدردیاں حاصل رہیں۔ بلاشبہ ۷، اور ۸ رجون کی فائرنگ سے بے شمار مزدور شہید ہوئے، ان گنت مزدور خاندان تباہ ہو گئے مگر یہ کوئی انہونی بات نہیں۔ جب کبھی مزدور تحریک طبقاتی بنیاد پر شروع ہوتی ہے تو ریاستی مشینری اسے اسی طرح کچلنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ تو ابتدائے عشق ہے، ابھی تو ان راہوں میں صلیب و دار کی نجانے کتنی منزلوں سے گزرنا پڑے گا۔ چھوٹی بڑی قربانیاں بالآخر ایک عظیم کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ قربانیوں سے جدوجہد انقلابی رنگ اختیار کرتی ہے۔ البتہ یہ بات بائیں بازو کے ٹرائنگ رہنماؤں کو ضرور ناگوار گزرتی ہے اور وہ [مز]دوروں کی خالص طبقاتی جدوجہد کو بدنام کرنے کے لیے الٹی سیدھی تنقید کا سہارا لیتے ہیں۔

نیشنل عوامی پارٹی نے ابتدا ہی سے اس تحریک سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کے چند رہنماؤں نے مزدوروں میں گھس کر ان کی جدوجہد کو اپنی پارٹی کے حق میں استعمال کرنا چاہا۔ سازشیں اور توڑ جوڑ کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مگر مزدوروں نے طبقاتی شعور اور نظم و ضبط کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی جدوجہد سے انہیں ISOLATE کر دیا۔ نیپ کے رہنماؤں نے مزدور ایکشن کمیٹی کے بعض رہنماؤں پر الزام تراشی بھی کی۔ وہ سرمایہ داروں کے اشارے پر ہڑتال جاری رکھوا کر مزدوروں کی طاقت کو تباہ کرنے کی سازشیں کر رہے تھے جس میں انہیں ناکامی ہوئی۔ اور اب وہ ایک بار پھر متحدہ مزدور فیڈریشن اور دوسری مزدور تنظیموں کی قیادت پر الٹے سیدھے الزامات عائد کر کے اپنے پاگل پن کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔

۲ رجولائی کو مزدوروں نے نیپ کو شہید چوک پر جلسہ کرنے کی اجازت نہ دی تو اس جگہ سے تقریباً ایک ہزار گز کے فاصلے پر نیپ نے ٹرکوں کے ذریعے کرائے کے آدمی بلوا کر جلسہ کیا۔ واضح رہے کہ نیپ کے زیر اہتمام مزدوروں کے جلسے سے سفید پوش سیاسی رہنما محمود الحق عثمانی نے خطاب کیا۔ موصوف اپنی سیاسی زندگی میں ہمیشہ خالص مزدور تحریک کے مخالف رہے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ "مزدور تحریک کو سیاسی پارٹی کے تابع ہونا چاہیئے۔ مزدوروں کی قیادت کا حق صرف اور صرف نیپ کو پہنچتا ہے"۔ چنانچہ تقریر کے دوران انہوں نے ٹھیٹ موقع پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ — "مزدور تحریک سیاسی پارٹیوں کی حمایت سے آگے نہیں بڑھ سکتی، مزدور لیڈری کا دعویٰ کرنے والے دراصل مزدوروں میں نیپ کی مقبولیت سے بوکھلا گئے ہیں —"

محمود الحق عثمانی کا یہ کہنا کہ "مزدور تحریک سیاسی پارٹیوں کی حمایت سے آگے نہیں بڑھ سکتی" انتہائی گمراہ کن ہے۔ پاکستان میں مزدور تحریک کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ یہاں کے مزدوروں کو کسی نہ کسی طرح سے سیاسی پارٹیوں کا دُم چھلا بنائے رکھا گیا۔ مزدوروں کو سیاسی پارٹیوں نے اپنے مخصوص اغراض کے لیے استعمال کیا اور انہیں چھوڑ دیا۔ ان کے اندر سے قیادت کو ابھرنے کا موقع نہ دیا۔ نہ ہی طبقاتی بنیاد پر مزدور تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ علاوہ ازیں سیاسی پارٹیوں نے مزدوروں کی طبقاتی جدوجہد کا رُخ موڑنے کے لیے انہیں ہمیشہ معاشی مراعات کے حصول کی جدوجہد میں الجھائے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۵ سال گزرنے کے باوجود پاکستان کے محنت کش طبقاتی بنیاد پر منظم اور متحد ہونے میں ناکام رہے۔ چنانچہ نیشنل عوامی پارٹی نے روسی سوشل سامراج کی بین الاقوامی حکمت عملی کے تابع رہتے ہوئے پاکستان کے مزدوروں کی طبقاتی جدوجہد سے ہمیشہ غداری کی اور انہیں بورژوا سیاست کی گندگی میں پھنسائے رکھا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی نیپ نے مزدور تحریک کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مزدوروں نے نیپ کو جھٹک کر اعلان کر دیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کے آلہ کار بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہی بات نیپ کو ناگوار گزری اور جن کی قیادت میں مزدوروں نے دس روزہ کامیاب ہڑتال کی اب ان پر کیچڑ اچھالے جا رہے ہیں۔

نیپ سیاسی میدان میں پیپلز پارٹی کی حریف ہے۔ ۷ رجون کی فائرنگ کے بعد مزدوروں میں پیپلز پارٹی کے خلاف بڑھتی ہوئی طبقاتی نفرت کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے فوراً حرکت میں آ گئی۔ نیپ نے مزدوروں کی اس طبقاتی جدوجہد کو بورژوا سیاسی تحریک کا رنگ دینا چاہا۔ یہ اس کے مخصوص مفادات تھے۔ تحریک

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیے

احوال واقعی

پاکستان نے بھارتی دباؤ قبول کرنے سے انکار کردیا

بھارت کشمیر کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے

واقفِ حال

۲ جولائی کو شملہ کے سربراہ مذاکرات میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ

- مغربی پاکستان کی سرحدوں سے دونوں ملکوں کی فوجیں دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ سے پہلے کی پوزیشن پر واپس آجائیں گی۔
- کشمیر کی صورتِ حال کا تصفیہ ہونے تک موجودہ پوزیشن برقرار رہے گی۔
- تنازعات کا تصفیہ طاقت سے نہیں اقوامِ متحدہ کے منشور کے مطابق کیا جائے گا۔ دونوں فریق تخریبی کارروائیاں نہیں کریں گے۔
- دوسری پاک بھارت سربراہ کانفرنس پاکستان میں ستمبر ۱۹۷۲ء میں ہوگی۔
- سمجھوتے پر عمل درآمد ایک ماہ بعد شروع ہوگا۔

پاک بھارت سمجھوتے کا اعلان غیر متوقع تھا۔ مذاکرات کی کامیابی کے امکانات نہیں تھے۔ ۲ جولائی کی سہ پہر کو خود صدر بھٹو نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ

"میں ہرگز یہ نہیں کہوں گا کہ معاملات بڑی خوش اسلوبی سے آگے بڑھے ہیں۔ اس میں اونچ نیچ بھی ہوئی ہے..... مذاکرات میں افسوسناک تعطل پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن میں نے اور بھارتی وزیر اعظم نے آخر وقت میں پُرعزم اور ازسرِنو کوشش کرنے پر رضامندی ظاہر کردی ہے تاکہ کچھ محدود کامیابی حاصل کی جاسکے۔"

چنانچہ دونوں سربراہوں نے ڈنر کے بعد آخری ملاقات کی یہ ملاقات ۵ امنٹ جاری رہی۔ اس میں سمجھوتے کی حتمی تفصیلات کو آخری شکل دی گئی۔ اس کے بعد دونوں سربراہوں نے اپنے معاونین کو ملاقات کے کمرے میں بلایا۔ مسز اندرا گاندھی نے اپنے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ، وزیر دفاع جگ جیون رام، وزیر خزانہ چاون اور وزیر زراعت فخر الدین علی احمد سے صلاح مشورے کرنے کے بعد سمجھوتے پر دستخط کردیئے۔ صدر بھٹو کے معاونین ارباب سکندر خاں خلیل۔ غلام مصطفیٰ جتوئی۔ حیات محمد خاں شیرپاؤ اور ملک معراج خالد تھے۔

شملہ مذاکرات میں پاکستان کے لئے اہم ترین مسائل یہ تھے۔

- مغربی پاکستان اور کشمیر میں دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ سے پہلے والی پوزیشن پر دونوں ملکوں کی فوجوں کی واپسی۔
- جنگی قیدیوں کی غیر مشروط واپسی۔

لیکن دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد بھارت کو فاتح کی حیثیت حاصل تھی۔ پاکستان شکست خوردہ تھا۔ پاکستان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت کی حکومت مغربی پاکستان کی تسلیم شدہ بین الاقوامی سرحد میں ردوبدل کی خواہش مند تھی اور جنگ بندی لائن ہی کو مستقل بین الاقوامی سرحد کی شکل دینا چاہتی تھی۔ بھارتی اخبارات سے اس رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ روزنامہ امرت بازار (کلکتہ) ۲۹ مئی ۱۹۷۲ء کو اپنے اداریہ میں لکھتا ہے۔

"دونوں ملکوں کے درمیان نئی حد متارکہ جنگ کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کرالیا جائے۔"

ہفت روزہ آرگنائزر (دہلی) ۳ جون کی اشاعت میں بھارتی حکومت کو مشورہ دیتا ہے کہ

"اکھنور کے علاقے میں ہماری افواج نے کچھ پیش قدمی کی تھی۔ اب بھارت کو ان علاقوں سے نکلنا مشکل ہوگا۔ اسی طرح شکر گڑھ سیکٹر میں کچھ علاقے ہمارے پاس ہیں۔ اگر اب بھارت سمبا اور کاٹھوہ کے علاقوں میں اپنی آمد و رفت جاری رکھنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ شکر گڑھ تحصیل کے علاقے ہر حالت میں اپنے قبضے میں رکھے۔ حسینی والا سیکٹر میں دس کیلومیٹر علاقہ پاکستان کے قبضے میں ہے اور بھارت کے پاس ایک کیلومیٹر لیکن اس علاقے میں بھارت کو پیچھے نہ آنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر کبھی موقعہ ملا۔ تو اسی جگہ سے بھارت فاضلکا سیکٹر پر حملہ کرسکتا ہے۔"

بھارتی اخبارات کے ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھارتی۔ جن سنگھی اور انتہا پسند رہنما پاکستان پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتے تھے۔ غیر مساوی سمجھوتہ چاہتے تھے لیکن غیر مساوی سمجھوتے کبھی پائیدار نہیں ہوتے۔ اگر ایک فریق کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طاقت ور فریق یک طرفہ سمجھوتہ مسلط کردے تو کچھ عرصے کے بعد جنگ کے شعلے دوبارہ بھڑک اٹھتے ہیں۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد اتحادیوں نے جرمنی کے تمام مفادات کو یکسر نظر انداز کرکے اس پر اپنا معاہدہ مسلط کردیا۔ اس یک طرفہ معاہدہ کا نتیجہ ۲۰ سال کے بعد جنگِ عظیم دوم کی صورت میں برآمد ہوا۔ جس نے دنیا کو سوائے بربادی اور تباہی کے اور کچھ نہیں دیا۔

لیکن مذاکرات کے آخری وقت میں مسز اندرا گاندھی نے مغربی پاکستان کی سرحدوں سے دونوں ملکوں کی فوجیں دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ سے پہلے والی پوزیشن پر واپس بلوانے پر سمجھوتہ کرکے معقولیت کا ثبوت دیا ہے۔ اس سمجھوتے سے بھارت میں جن سنگھیوں اور پاکستان میں جماعتیوں کو یقیناً مایوسی ہوگی۔ وہ اس کے خلاف ضرور تحریک چلائیں گے۔

سمجھوتے میں کہا گیا ہے کہ کشمیر کی صورتِ حال کا تصفیہ ہونے تک موجودہ پوزیشن برقرار رہے گی۔ بالفاظِ دیگر دونوں ملکوں کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آراء رہیں گی۔ کشمیر کی سرحد پر چھیڑ چھاڑ جاری رہے گی۔ بھارت کشمیر کی موجودہ جنگ بندی لائن کو مستقل بین الاقوامی سرحد تسلیم کراکر کشمیر کا تنازعہ ہمیشہ کے لئے حل کرنا چاہتا تھا۔ بھارتی اخبارات اور جن سنگھیوں نے اس مسئلہ پر بہت زور دیا۔ ہفت روزہ "آرگنائزر" (دہلی) نے ان عناصر کی ترجمانی کرتے ہوئے ۳ جون ۱۹۷۲ء کو لکھا۔

"کارگل سیکٹر میں ہماری گورکھا، پنجابی اور ملیشیا فوجوں نے پہاڑیوں کی بلندیوں تک جنگ کی۔ اور ۴۶۰۰ میٹر بلندی تک جاپہنچی اور بہت بڑا رقبہ لے لیا۔ جو سری نگر لیہہ روڈ پر قابو پانے کا ذریعہ بنا۔ پھر ہماری فوجوں نے آگے بڑھ کر اولڈنگ تھنگ پر قبضہ کرلیا۔ جہاں سے ہم سندھ طاس پر اثر انداز

پاک بھارت سمجھوتے سے جن سنگھی اور جماعتیے مایوس ہونگے

ہوں گے۔ یہ فتح فوجی لحاظ سے بہت اہم تھی جب کہ ہماری فوجیں کارگل سیکٹر میں اور بھی کچھ چوکیوں پر قبضہ کر چکی تھیں۔ جن پر قبضے کے بعد سرینگر لیہہ روڈ پر مکمل ہمارا تسلط ہو گیا۔ اس لئے اب بھارتی افواج ان پہاڑی علاقوں پر اپنا قبضہ چھوڑنے پر تیار نہیں ہوں گی۔"

جن سنگھی رہنما اس سے بھی آگے بڑھ گئے اور پورے کشمیر کو بھارت کا حصہ قرار دیتے ہوئے اندرا حکومت سے مطالبہ کیا کہ "کشمیر کے علاقے میں جنگ بندی لائن کو مستقل سرحد تسلیم نہ کرایا جائے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کشمیر کا وہ علاقہ جو ہمارے پاس نہیں ہے وہ کشمیر سے ہمیشہ کے لئے الگ ہو جائے گا۔ جب کہ وہ علاقہ کشمیر کا حصہ ہے۔"

(روزنامہ "ہندو"، ۷ جون ۱۹۷۲ء)

ہو سکتا ہے کہ کشمیر کے تنازعہ پر ستمبر ۱۹۷۲ء میں ہونے والی سربراہ کانفرنس میں بات چیت ہو۔ کیونکہ پاکستان کشمیریوں کے حق خود اختیاری کی حمایت سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان اب تک تین جنگیں ہوئی ہیں اور ان تینوں میں کشمیر کا تنازعہ ملوث رہا۔ جب تک کشمیریوں کو حق خود اختیاری نہیں ملتا۔ اس وقت تک برصغیر پاک و ہند میں پائیدار امن قائم نہیں ہو سکتا۔

بھارت چاہتا تھا کہ پاکستان "جنگ نہ کرنے کا معاہدہ" (No war Pact) کرے اور اپنے دفاعی بجٹ میں کمی کرے۔ مسز اندرا گاندھی یہ تاثر دے رہی تھیں کہ پاکستان زبردست فوجی تیاریاں کر رہا ہے۔ جنگ کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ بھارتی اخبارات نے بھی اس گمراہ کن پروپیگنڈہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

"پاکستان کے حکمرانوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے۔ مستقبل میں دوستانہ پاک بھارت تعلقات کا انحصار اسی بات پر ہے کہ قابل قبول معاہدۂ امن کیا جائے۔ لیکن اس مسئلے پر صرف اس بات کی یقین دہانی کرانا ہی کافی نہیں کہ معاہدہ امن کی بات کی جائے۔ بلکہ پاکستان کی فوجی لفزی میں بھی تخفیف کی جائے۔ کیونکہ پاکستان میں آج ۵ ۶ کروڑ آبادی ہے۔ جب کہ بھارت کی آبادی ۵۶ کروڑ ہے۔ اس اعتبار سے بھارت اور پاکستان کی آبادی کا تناسب ۱۰/۱ ہے۔ اس لئے پاکستان کو اپنی آبادی کے لحاظ سے ۱/۸ تناسب سے زیادہ اخراجات نہیں کرنے چاہئیں۔ اور نہ ہی بھارت پاکستان کو اس کے وسائل سے زیادہ فوجی اخراجات کی اجازت دے۔"

(روزنامہ امرت بازار (کلکتہ) مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۷۲ء)

"پاکستان کے چیف آف سٹاف جنرل ٹکا خان مسلسل سرحدی علاقوں کے دورے کر رہے ہیں کہیں کہیں سرحدی جھڑپیں بھی ہوئیں۔ اب تک وہ چین سے نہیں بیٹھے اور جنگ بندی لائن پر مورچوں کے دورے جاری ہیں۔ اس طرف بھی دھیان رکھا جائے کہ ان کا ایما کیا ہے۔

(ہفت روزہ "آرگنائزر" دہلی)، ۲۰ مئی ۱۹۷۲ء)

"پاکستان اپنی بحری فوجی طاقت میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کاٹھیاواڑ کی بندرگاہ کی طرف اس کی نظریں ہیں"

(آرگنائزر (دہلی) ۳ جون ۱۹۷۲ء)

لیکن شملہ مذاکرات میں صدر بھٹو نے اسی سلسلے

غیر مساوی سمجھوتہ
برصغیر میں پائیدار امن
کی ضمانت نہیں بن سکتا

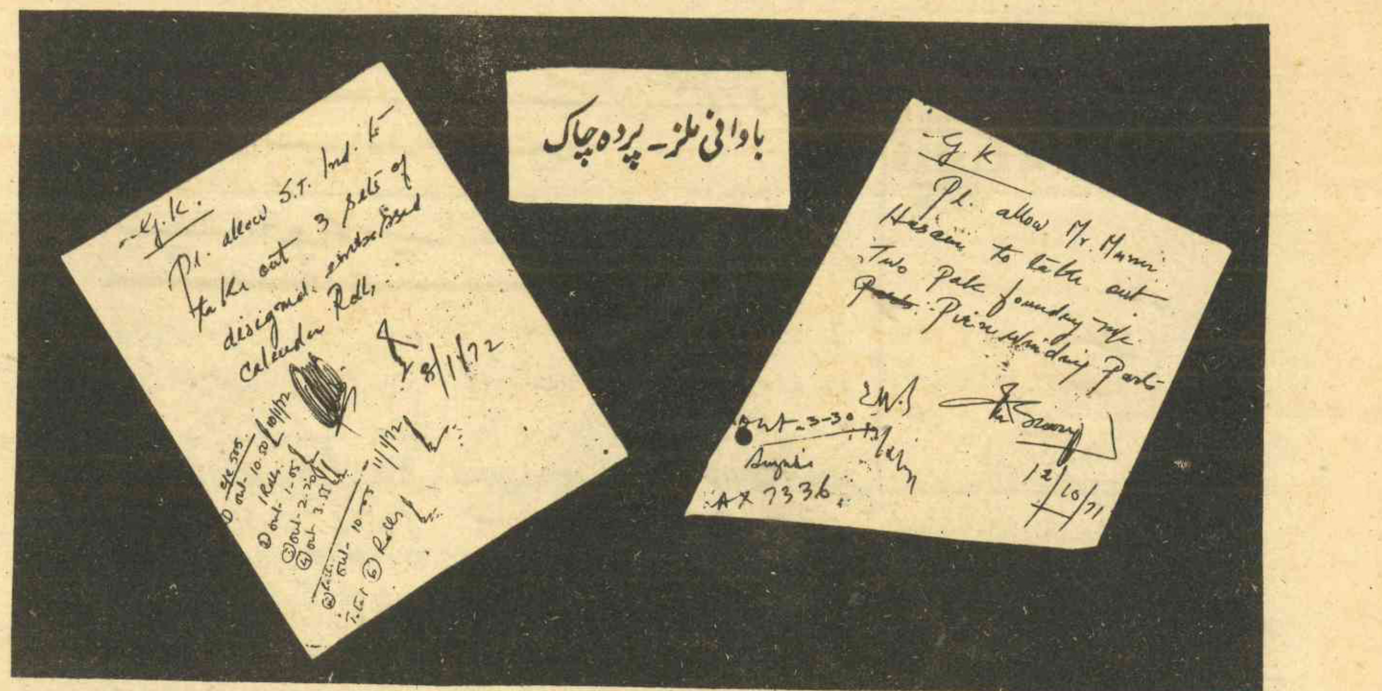
میں واضح اور دو ٹوک مؤقف اختیار کیا۔ ۲ جولائی کو پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ:-

"میں جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی اصطلاح پر یقین نہیں رکھتا .... ہم دفاع پر جو اخراجات برداشت کرتے ہیں وہ جارحیت کے لیے نہیں۔ پاکستانی عوام نے پہلے ہی بڑی تکالیف برداشت کی ہیں۔ ان کا آدھا ملک ہاتھ سے چلا گیا، اب وہ اس مرحلے پر اپنے دفاع کو کمزور نہیں کر سکتے۔"

جنگی قیدیوں کی رہائی کے بارے میں مذاکرات کے دوران بھارت نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ پاکستانی فوج نے بھارت اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کمان کے سامنے ہتھیار ڈالے ہیں۔ جب تک کہ اس کا دوسرا فریق یعنی بنگلہ دیش قیدیوں کی واپسی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا اس وقت تک بھارت اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔ دراصل بنگلہ دیش اور بھارت پاکستان کے جنگی قیدیوں کو، بنگلہ دیش تسلیم کرانے کے لیے "ترپ" کے پتے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں لیکن پاکستان کے عوام بنگلہ دیش کو تسلیم کرانے کے حق میں نہیں ہیں، کیونکہ بنگلہ دیش بھارت اور سوشل سامراج سوویٹ یونین کی جارحیت کا نتیجہ ہے۔ ایسی ننگی جارحیت جس نے بین الاقوامی اور بنڈونگ کانفرنس کے تمام اصولوں کو پامال کر دیا۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مقصد بھارتی اور سوویت یونین کی جارحیت کو تسلیم کرنا اور بنگلہ دیش کی غیر قانونی پیدائش کو قانونی شکل دینا ہے۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مطلب علیحدگی پسندوں اور بھارتی توسیع پسندی کی حمایت کرنا ہے۔ اگر بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا گیا تو کل مغربی پاکستان میں بھی علیحدگی کی تحریک چلے گی۔ بھارت اس موقع سے بھی فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلح جارحیت کرے گا۔ اسے سوویت یونین کی بھی حمایت حاصل ہوگی۔ کیونکہ روسی وزیر اعظم الیکسی کوسیجن نے صدر بھٹو کے دورہ ماسکو کے دوران کہا تھا کہ

"برصغیر کے معاملے میں ہم نے جو کچھ کیا وہ بالکل جائز تھا اور اگر تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا تو ہم پھر وہی کچھ کریں گے"

اس کے علاوہ بنگلہ دیش کے عوام شیخ مجیب کی حکومت سے نفرت کرتے ہیں۔ بنگلہ دیش کی حکومت صرف ڈھاکہ تک محدود ہے۔ بنگالی عوام نے شیخ مجیب اور بھارتی توسیع پسندوں کے خلاف مسلح جنگ شروع کر دی ہے۔ اگر ہم نے اس وقت بنگلہ دیش کو تسلیم کیا تو یہ بنگالی عوام سے غداری کے مترادف ہوگا۔ اس لیے ہمیں چاہیئے کہ انتظار کریں اور شیخ مجیب کے بنگلہ دیش کی بجائے "عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش" کو تسلیم کریں۔



گودام کے انچارج کے نام ہدایات کا عکس۔ جس میں مشینیں دینے کا حکم دیا گیا ہے

باوانی نے عدالت عالیہ کے حکم کو نظر انداز کر دیا

الفتح رپورٹ

پاکستان کے بائیس خاندانوں میں سے باوانی خاندان آٹھویں نمبر پر ہے۔ بائیس خاندانوں میں شاید ہی کوئی خاندان مزدوروں پر ظلم و ستم، جبر و تشدد، ٹیکسوں کی چوری اور دیگر بدعنوانیوں میں باوانی خاندان کو مات دے سکے۔ پاکستان میں آنے سے قبل یہ خاندان برما میں کپڑے کا کاروبار کرتا تھا۔ ایک مدت تک برمی محنت کشوں اور عوام کا استحصال کرتا رہا، ان کا خون چوستا رہا اور اپنی تجوریاں بھرتا رہا۔ حتیٰ کہ برما میں نئی حکومت برسرِ اقتدار آگئی۔ اس نے اس جونک کی تمام املاک ضبط کر لی۔ برما سے اس نے پاکستان کا رخ کیا۔ باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز قائم کی۔ استحصال کی کڑوی گولی پر اسلام پسندی کی چینی چڑھا کر خونی چمگادڑ کی طرح پاکستان کے محنت کشوں کا خون چوسنے لگا۔ برما کے استحصالی تجربے اور اسلام پسندی کی بدولت دیکھتے ہی دیکھتے بائیس خاندانوں کی صف میں آٹھویں نمبر پر آگیا۔

باوانی خاندان حکومت کو دھوکہ دینے اور ٹیکس بچانے میں ماہر ہے۔ وہاں کے مزدور بتاتے ہیں کہ اگر صرف یہ حساب لیا جائے کہ ہوزری کے کھاتے میں کس قدر سوت آتا ہے اور اس خام مال سے کتنا تیار مال بنایا جاتا ہے تو ان کی بے ایمانیوں کا پتہ چل جائے گا۔ یہ لوگ بتاتے ہیں کہ خام مال کے اندراج میں کوئی تناسب نہیں۔ تیار شدہ مال چور دروازوں سے بازار میں بھیج دیا جاتا ہے اور رجسٹروں میں دکھایا جاتا ہے کہ خام مال ضائع (WASTE) میں چلا گیا اور اس طرح نقصان کو بڑھا چڑھا کر دکھایا جاتا ہے —!

باوانی نے نیشنل بنک کے افسران کو ساتھ ملا کر اور دیگر طریقوں سے اثر انداز ہو کر لاکھوں روپے کے قرضہ جات وصول کیے ہیں۔ ان قرضوں کی ضمانت کے طور پر ۱۹۵۴ء، ۵۵، اور ۱۹۵۶ء کے خریدے ہوئے رنگ (DYES) جو اب بالکل سڑ چکے ہیں اور پھینک دینے کے قابل ہیں، نیشنل بنک کے پاس گروی رکھوائے گئے ہیں۔ نیشنل بنک کے افسران وقفے وقفے سے گوداموں کا سروے کرتے ہیں اور اس تلف شدہ مال کو صحیح بتا کر یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ بنک کا قرضہ محفوظ ہے۔

۱۹۶۸ء میں ملوں پر گنجائش ٹیکس لگایا گیا تو باوانی نے اس سلسلے میں ایک رٹ درخواست مغربی پاکستان ہائیکورٹ میں داخل کی۔ فاضل ججوں نے حکمِ امتناعی جاری کرتے ہوئے حکم دیا کہ جب تک اس درخواست کا فیصلہ نہ ہو جائے مل کے مالکان کسی قسم کی مشینری مل سے نہیں اکھاڑ سکتے۔ اس کے باوجود باوانی کے ۱۹۶۹ء میں ویلوونگ ڈیپارٹمنٹ سے ایک سو بیس مشینیں اکھاڑ کر شیر شاہ میں بیس بیس مشینوں کی مختلف فیکٹریاں مختلف ناموں سے قائم کر رکھی ہیں۔ ان فیکٹریوں کے نام نہاد مالکان باوانی کے پرانے ملازمین اور مزدور دشمن چمچے ہیں۔ پھر یہ بیس بیس مشینوں کی فیکٹریاں بھی صرف اس وجہ سے لگائی گئی ہیں کہ اس طریقے پر تمام مال بغیر ایکسائز ڈیوٹی دیئے ہوئے بازار میں پہنچایا جاسکتا ہے اس سلسلے میں ہم سٹیل کے منیجر کے دستخط شدہ کاغذات

ایکسائز ڈیوٹی ادا کئے بغیر

مال بازار میں

پہنچا دیا جاتا ہے

پر قبضہ کیا ہے جس میں انہوں نے ڈیپارٹمنٹ کے انچارج کو ہدایت کی ہے کہ مشینیں نکال لی جائیں ۔ خدشہ ہے کہ باوانی اس طرح سے ان مشینوں کو جن کے لیے زرمبادلہ حکومت پاکستان نے فراہم کیا تھا ۔ اور جن سے یہ کئی گنا منافع بھی کما چکے ہیں ۔ ان کو یہ بازار میں فروخت کر کے سرمائے کی ایک ایک پائی ملک سے باہر بھیج دیں گے ۔

ایک اور وجہ جو ان مشینوں کو دوسری جگہ منتقل کرکے چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں قائم کرنے کی ہے وہ یہ کہ نئی قائم شدہ فیکٹریوں پر حکومت انکم ٹیکس کی چھوٹ دیتی ہے اور اس طرح یہ اپنے منافع پر جو کہ پہلے ہی حسابات میں گڑبڑ کرکے کم سے کم دکھایا جاتا ہے ۔ مزید انکم ٹیکس بھی صاف بچا جاتے ہیں ۔

دو سال انہوں نے ایک اسپنگ ڈیپارٹمنٹ میں بارہ ہزار اسپنڈل ناکارہ بنا کر نکال دیئے ۔ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ آخر ان اسپنڈلوں کا جو کہ اچھی خاصی حالت میں چل رہے تھے ۔ انہوں نے آگے چل کر کیا کیا لیکن انہوں نے اس کے بدلے میں حکومت سے زرمبادلہ کے قرضے حاصل کیے اور بارہ ہزار نئے اسپنڈل درآمد کیے ۔ یہ قرضہ باوانی انڈسٹریز کے نام پر حاصل ہوا تھا اور اسپنڈل کی درآمد بھی باوانی انڈسٹریز کے نام سے کی گئی تھی لیکن بجائے باوانی انڈسٹریز کے یہ اسپنڈل واحد ٹیکسٹائل مل کے نئے حساب میں ڈال دیئے گئے ۔ اور پھر واحد ٹیکسٹائل کے نام سے انہوں نے حکومت سے ٹیکس کی چھوٹ بھی لے لی ۔

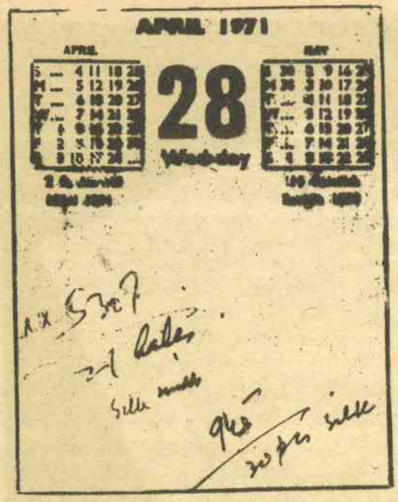
اس خرد برد میں ایکسائز کے محکمہ نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا اور واحد ٹیکسٹائل کے نام سے یہ کرگھے نصب کرنے کے لیے اس رشوت خور محکمہ نے انہیں واحد ٹیکسٹائل کے نام کا ایکسائز کا لائسنس جاری کر دیا ۔ حالانکہ لائسنس جاری کرتے وقت کم از کم اتنا تو ضرور دیکھا جاتا ہے کہ الیکٹرک سپلائی نے اس نام پر کنکشن بھی دیا ہے یا نہیں ۔ الیکٹرک سپلائی کی طرف سے اس نام پر کوئی کنکشن نہیں دیا گیا اور لائسنس دینے کی تمام کارروائی غیر قانونی اور سرمایہ داروں کو ناجائز منافع پہنچانے کی غرض سے کی گئی ہے ۔

۶۹-۱۹۶۸ء میں ایک اور قرضہ انہوں نے "پک اک" سے لیا جس کی مالیت پچاس لاکھ روپے ہے ۔ یہ قرضہ انہیں زرمبادلہ میں ملا تھا اور اس کے تحت انہیں AUTCONER MACHINE اور اس سے متعلقہ مشینیں منگانے کے لیے دیا گیا تھا ۔ یہ مشینری وہاں فیکٹری میں نصب کرانے کے بجائے باہر ہی سے باہر بھیج دی گئی ۔ کچھ مزدوروں نے یہ بھی خدشہ ظاہر کیا ہے کہ مشینری منگوائی ہی نہیں گئی ۔ بلکہ اس کی جگہ مشینری ہی کے نام پر کچھ اور چیزیں جو مہنگے داموں پر فروخت کی جا سکتی ہیں منگا کر باہر سے ہی باہر بھیج دی گئیں ۔ ہمیں بتایا جائے کہ صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے زرمبادلہ میں قرضہ جات کیا اس لیے دیئے جاتے ہیں کہ صنعتی ترقی نہ ہو اور صرف منافع ہی کمایا جائے ۔

اگر ان سے شیئر ہولڈروں کا رجسٹر مانگا جائے تو پتہ چلے گا کہ کچھ ایسے شیئر ہولڈروں کا منافع یہ بوگس دستخط بنا کر کھا گئے ہیں جن کا انتقال ہو چکا ہے ۔ اس سلسلے میں ان پر ایک کیس بھی چل رہا ہے ۔

سنگاپور میں انہوں نے ماجین اینڈ کمپنی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کیا ہے جس کو یہ مال برآمد کرتے ہیں نہ صرف سنگاپور میں بلکہ نیپال، تھائی لینڈ، ہانگ کانگ برطانیہ، یورپ میں ہر جگہ ان کے ذیلی تجارتی ادارے کام کر رہے ہیں جن کو مال برآمد کیا جاتا ہے ۔ یہ برآمد کیے جانے والے مال کی قیمت اوسطاً آدھی قیمت کے کاغذات بناتے ہیں ۔ اور برآمد شدہ مال کو گھٹیا کوالٹی کا دکھاتے ہیں ۔ اس طرح سے اس مال پر ملنے والا تمام تر منافع ملک کے باہر ہی ان کے بھائیوں بھتیجوں کو مل جاتا ہے ان میں سے ہر ایک کے پاس کئی کئی ملکوں کے پاسپورٹ ہیں اور اس طرح یہ اپنا بین الاقوامی سازشی دھندا چلا رہے ہیں دوسری طرف اس کی قیمت کم دکھانے کی وجہ سے ان کی ایکسائز ڈیوٹی بھی بچ جاتی ہے ۔

ایکسائز ڈیپارٹمنٹ کے تعاون سے یہ لوگ بڑے پیمانے پر دھاندلیاں کر رہے ہیں ۔ ہمیں متعلقہ افسر کی میز سے ایک ڈائری ملی ہے جس کے تقریباً ہر ورق پر فیکٹری سے



ملز کے ایک افسر کی ڈائری کا ایک ورق، جس میں غیر قانونی طور پر نکلنے والے مال کی تفصیلات اور ٹرک نمبر درج ہے

غیر قانونی طور پر نکلنے والے مال کی تفصیلات متعلقہ افسر کے اپنے ہاتھ سے درج کی ہوئی ہیں ۔ یہ تفصیلات صاف طور پر ٹرک کا نمبر، ٹرک کمپنی کا نام اور ٹرک میں لدے ہوئے مال کی مقدار بتاتی ہیں ۔ اگر اس ڈائری میں لکھے ہوئے مال کا اندازہ لگایا جائے جو کہ مل کے پچھلے دروازوں سے بغیر ٹیکس دیئے ہوئے نکال دیا گیا تو پتہ چلے گا کہ یہ ملک دشمن لوگ ہر ماہ لاکھوں روپے کا ٹیکس بچاتے ہیں ۔

دوسری طرف اس تیار شدہ مال کا بھی کہیں اندراج نہیں ہوتا ۔ پروڈکشن کم دکھائی جاتی ہے اور نقصان کے کھاتے آپ سے آپ بڑھتے رہتے ہیں ۔

مجھے تقریب میں مدعو نہ کریں "جنگ" ناراض ہو جائے گا

ابراہیم جلیس

پاکستان کو محنت کش انسانوں کی جنت ارضی بنانے کے عزم و عمل سے مسلح انقلابی نوجوانوں کی تنظیم "ینگ اسپیکرز فورم" کا سالانہ کنونشن پچھلے دنوں کراچی میں منعقد ہوا۔ اس تقریب کے منتظمین کی عنایت اور محبت کہ انہوں نے مجھے بھی اس تقریب میں نہ صرف رسمی شرکت بلکہ تقریر کرنے کی بھی دعوت دی۔

جب کبھی کسی درس گاہ، کسی سیاسی اور سماجی تنظیم کی طرف سے کسی تقریب میں مجھے مدعو کیا جاتا ہے تو میں سب سے پہلے منتظمین کو آگاہ کر دیتا ہوں کہ

" اگر آپ نے مجھے اپنی تقریب میں مدعو کیا تو اخبار جنگ اور اس کے ذیلی اخبارات ڈیلی نیوز اور اخبار جہاں آپ کی تقریب کا بائیکاٹ اور اس کی کارروائی کا بلیک آؤٹ کر دیں گے۔"

لیکن مجھے بڑی حیرت اور خوشی ہے کہ میری اس ایماندارانہ وضاحت کے باوجود عام جلسوں اور خصوصی تقریبات کے منتظمین مجھے بالالتزام اپنی تقریبات میں مدعو کر کے مجھے مقام فخر عطا کرتے ہیں کہ ان کی نظر میں کثیر الاشاعت اخبار جنگ اتنا بڑا اور اہم نہیں جتنا کہ ان کا یہ خاکسار ساتھی اہل قلم اہم ہے۔

تقریباً سارے ہی منتظمین تقاریب سے مجھے یہی جواب ملا کہ

" اگر ہمیں اخبار جنگ کی پرواہ ہوتی تو ہم آپ سے رجوع ہی کیوں کرتے۔؟ "

منتظمین تقاریب کے اس جواب کا دستاویزی ثبوت یہ ہے کہ مجھے اخبار جنگ سے علیحدہ ہوئے اب کوئی دو برس ہو چکے ہیں۔ اور ان دو برسوں میں اب تک میں سینکڑوں جلسوں اور تقاریب میں بہ حیثیت صدر، مہمان خصوصی یا اہم مقرر کے شریک ہوتا رہا ہوں۔

حالانکہ دوسرے دن اخبار جنگ میں ان جلسوں کی جو کارروائی شائع ہوتی رہی ہے اس میں سے میرا نام اور میری تصویر حذف کی جاتی رہی ہے۔

مجھے اخبار جنگ میں اپنا نام یا تصویر چھپوانے کا قطعاً کوئی شوق نہیں ہے۔ میں تو صحافت کے اس بنیادی اصول کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ۔

"کسی واقعے کی دیانت دارانہ رپورٹنگ کے معاملے میں بڑا اور معیاری اخبار ذاتی پسند اور ناپسند، ذاتی دشمنی اور دوستی سے بلند ہوتا ہے۔"

صحافت کے اس بنیادی اُصول کے ضمن میں مجھے بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان کی اعلیٰ ظرفی کا ایک روح پرور واقعہ یاد آتا ہے کہ جن دنوں مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک نے "زمیندار" کے مقابلے میں روزنامہ انقلاب جاری کیا تھا، تو بابائے صحافت اور مہر و سالک میں بڑے زوروں کی ٹھن گئی تھی۔ یہ شعری گولہ باری اس قلمی جنگ کی یادگار ہے کہ ؎

زمیندار ایک، آپ اتنے مگر اوج صحافت پر
یہ اک تکّل لڑے گا، آپ کی ساری پتنگوں سے

؎ انقلابات ہیں زمانے کے !
مہر و سالک کے انقلاب کو دیکھ

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن اخبار زمیندار میں ایک ایسے جلسے کی کارروائی بغرض اشاعت موصول ہوئی جس کے صدر مولانا غلام رسول مہر تھے اور مہمان خصوصی مولانا عبدالمجید سالک۔ نیوز ایڈیٹر ایک چاپلوس نوجوان تھے۔ انہوں نے اس خبر سے مولانا مہر اور مولانا سالک کے نام کاٹ دیئے اور داد حاصل کرنے مولانا ظفر علی خان کے پاس پہنچے کہ۔

"مولانا۔ دیکھئے میں نے اس خبر سے آپ کے دونوں دشمنوں کے نام کاٹ دیئے ہیں۔" تو داد دینے کے بجائے مولانا ایک دم آگ بگولہ ہو گئے اور بولے۔

" برخوردار۔ خبردار جو تم نے آئندہ پھر کبھی ایسی حرکت کی۔ مہر و سالک میرے لاکھ دشمن سہی۔ وہ اس ملک کی مشہور اور اہم شخصیتیں ہیں۔ اگر ان کے نام کسی خبر میں آتے ہیں تو ان ناموں کا حذف کرنا صحافتی بددیانتی ہے۔ میری ان سے دشمنی اپنی جگہ اور صحافت کے اعلیٰ اصول اپنی جگہ۔ میں مہر و سالک کا دشمن ضرور ہوں لیکن کوئی کم نسب، کم ظرف اور چھوٹے دل کا آدمی نہیں ہوں۔ میری بات یاد رکھو کہ کوئی سچا صحافی کبھی بھی کم ظرف اور تھڑدلا نہیں ہوتا۔"

میں یہاں صحافت کی آبرو اور اعلیٰ معیار کے علمبردار مولانا ظفر علی خاں اور ان کے وقار صحافت اخبار زمیندار کا اخبار جنگ اور اس کے خالص کاروباری مالکان سے مقابلے کی جسارت نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ صرف اس حقیقت کو آشکار کرنا چاہتا ہوں کہ جس ملک کے "سب سے بڑے اخبار" میں ذاتی دشمنی کی خاطر صحافت کے اعلیٰ بنیادی اصولوں کو بھی پامال کر دیا جائے۔ اس ملک میں صحافت کا مقام کیا ہے۔!

جہاں تک میری ذات کا سوال ہے۔ یہی اخبار جنگ پورے گیارہ برس تک میرا نام، میرے کالم اور میری تصویریں نہایت فخر، اور اہتمام سے شائع کرتا رہا ہے۔ ادارۂ جنگ میں جب بھی کوئی غیر ملکی یا ملکی مہمان آتا تھا تو مالکان اخبار جنگ بڑے فخر سے میرا تعارف اُن سے کراتے تھے۔

میں تو اس وقت سے برصغیر پاک و ہند میں بام شہرت پر ہوں جب کہ اخبار جنگ کا دنیا میں کوئی وجود نہ تھا۔ یا پھر وہ دہلی میں

ناموں کو حذف کرنا صحافتی بددیانتی ہے

بیچ بچ دو ٹکے کا اخبار تھا یعنی اس کی قیمت واقعی دو ٹکے ہی تھی۔ اہل دہلی اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

گیارہ برس تک اخبار جنگ میں کام کرنے کے باعث میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اس لئے بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کسی شخصیت سے اخبار جنگ کے مالکان کی نفرت یا محبت "بنئے کے دھرم" کی طرح کاروباری ہوتی ہے۔ یعنی کمزور کی گردن مروڑ دینا اور طاقت ور کے پاؤں پکڑ لینا۔ یہی بنیا کا دھرم، یہی مالکانِ جنگ کی پالیسی۔

میں تو خیر کس شمار و قطار میں ہوں البتہ اپنے چشم دید اور گوش شنید واقعات کا مجسم گواہ ہوں کہ اب سے دو سال پہلے اسی اخبار جنگ کے انتظامی مدیر یوسف صدیقی نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ

"اخبار جنگ میں ذوالفقار علی بھٹو اور معراج محمد خان اور پیپلز پارٹی کے نام شائع نہیں ہو سکتے۔"

ایک بار اخبار جنگ کی عوام دشمن پالیسی کے خلاف طالب علموں اور مزدوروں نے مظاہرہ کیا تھا اور کھڑکیوں کے ایک دو شیشے ٹوٹ گئے تھے تو یوسف صدیقی نے چوکیداروں اور سپاہیوں کو جمع کر کے بڑے غصے سے یہ حکم دیا تھا کہ:

"اگر یہ دو ٹکے کے مزدور اور این۔ ایس ایف کے لونڈے دفتر میں گھسنا چاہیں تو ان ...
.... (فحش گالی) کی ٹانگیں توڑ دو!"

اخبار جنگ سے میری گیارہ سالہ وابستگی کے بعد اچانک علیحدگی کا سبب یہ تھا کہ میں ان دنوں اپنے کالموں میں ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کی حمایت میں اپنا زورِ قلم صرف کرتا تھا اور جب راولپنڈی "جنگ" کے دفتر کے سامنے ہڑتالی صحافیوں کی حمایت میں بھٹو صاحب نے تقریر کرتے ہوئے خاص طور پر میرا نام لیا کہ:-

"جنگ" والوں سے ہماری جنگ ہے
انہوں نے میرے دوست ابراہیم جلیس
اور دوسرے صحافی دوستوں کو الگ
کیا ہے!"

تو مالک اخبار نے مجھے بلا کر بڑی نفرت سے بھٹو صاحب کا نام لے کر کہا:-

"اب تو میں آپ کو کسی قیمت پر بھی
واپس نہیں لے سکتا ورنہ لوگ کہیں گے
کہ میں بھٹو سے ڈر گیا۔ اب جائیے اور
بھٹو سے کہیے کہ وہ آپ کو "جنگ" میں
واپس بھیج دے۔"

بھٹو سے نہ ڈرنے والے اس "بہادر اور با اصول" مالکِ اخبار نے بھٹو کے برسرِ اقتدار آتے ہی سب سے پہلے اپنا اخبار بھٹو صاحب کے قدموں پر رکھ کر نہایت گڑگڑا کر معافی مانگ لی اور ہمیشہ کے لیے خطِ وفاداری لکھ کر "جنگ" راولپنڈی ایڈیشن کے صفحۂ اوّل پر اپنے دستخط سے چھپوا دیا۔ یہ معافی نامہ کراچی ایڈیشن میں اس لیے شائع نہ کرایا کہ گزشتہ دو برس تک جنگ کراچی میں بھٹو صاحب کی مخالفت میں خبریں اور مضامین مسلسل چھپتے رہے تھے اور کراچی کے قارئین جنگ کی بھٹو دشمنی کو ابھی تک بھول نہیں سکے ہیں۔

جس معراج محمد خان کا نام اخبار "جنگ" کے مدیران گالی کے ساتھ لیا کرتے تھے۔ آج صفحہ اول پر اسی معراج محمد خان کی تصویریں اور بڑی بڑی خبریں چھاپ کر بڑی حیا اور شرم کے ساتھ اپنے پچھلے گناہوں کی تلافی کر رہے ہیں۔

بقول یوسف صدیقی این۔ ایس۔ ایف کے جن لونڈوں کی ٹانگیں توڑنے کا حکم دیا گیا تھا آج اس یوسف صدیقی کا سر انہی این۔ ایس۔ ایف کے لونڈوں کے پیروں میں ہے۔

ہمارے ملک کی سیاست میں بڑی غیر متوقع اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ اگر بالفرض میں بھی کسی اہم مقام پر پہنچ گیا تو یہی اخبار جنگ اسی طرح میرے پیروں میں بھی ہوگا جس طرح اب وہ "بہ کمال حیا" بھٹو صاحب معراج محمد خان، این۔ ایس۔ ایف کے لیڈروں اور مزدور تحریک کے علمبرداروں کے آگے دست بستہ ہے۔

کاش! اخبار جنگ کثیر الاشاعت اور کثیر الاشتہارات ہونے کے علاوہ با اصول صاحبِ کردار اور بلند معیار اخبار بھی ہوتا ——!

یہاں بر سبیل تذکرہ مثالاً رسوائے دہر مس کرسٹین کیلیر کا یہ مقولہ بے موقع نہ ہوگا کہ:-

"مجھے سارا زمانہ جانتا ہے، مجھے دیکھنے
کے لیے ہزاروں انسانوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ
جمع ہو جاتے ہیں لیکن مجھے دکھ اس بات کا
ہے کہ مجھے کوئی بھی عزت کی نظر سے نہیں
دیکھتا ——!"

پورے چاند کی رات میں وہ شیطانی رقص شروع کر دیتے ہیں



شکاگو میں
سو میں سے
پچھتر افراد
شیطان کے
پجاری ھیں



امریکہ
میں شیطان کی پوجا

الفتح فیچر

ہفتے کی رات ہے۔ نصف شب گذر چکی ہے۔ چاند پوری آب و تاب سے آسمان پر چمک رہا ہے۔ ہر طرف دودھیا روشنی کی چادر پھیلی ہوئی ہے۔ اس ڈھلی ڈھلائی رات کو گہری خاموشی کا کفن پہنا دیا گیا ہے۔ امریکہ کا شہر لوئزوائل سکوت میں ڈوبا ہوا انتہائی پراسرار منظر پیش کر رہا ہے۔ اس جگہ ایک نوجوان فوجی افسر کا مکان ہے۔ اس کے عقب میں درختوں اور جھاڑیوں کی طویل قطاریں کھڑی ہیں۔ جھینگروں اور کیڑے مکوڑوں کی جھائیں جھائیں سے پورا ماحول پراسرار اور انسانی اعصاب پر لرزہ طاری کر دینے والے خوف میں ملفوف ہے۔

نوجوان فوجی افسر کے مکان کے سامنے سیاہ رنگ کی ایک لمبی سی گاڑی رکتی ہے اور اس میں سے درجن بھر لڑکے اور لڑکیاں خاموشی سے مکان کے دروازے پر پہنچ جاتی ہیں۔ دروازے کے ٹھیک اوپر ایک گڑیا لٹکی ہوئی ہے۔ گڑیا کے کپڑوں پر سرخ رنگ کی چھینٹیں ہیں۔ اس کے جسم میں سینکڑوں سوئیاں پیوست ہیں۔ ان میں سے ایک نوجوان لڑکی آگے بڑھ کر کال بیل کا بٹن دباتی ہے فوجی افسر شاید ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ فوراً دروازہ کھول دیتا ہے اور سب کو اپنے ساتھ لے کر اندر چلا جاتا ہے۔ اس گروپ میں یونیورسٹی کے لڑکے اور لڑکیوں کے علاوہ ایک کمپیوٹر پروگرامر، اور ایک اسٹور کلرک اور نفسیات کا ایک استاد بھی شامل ہے جو یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔

فوجی افسر کی قیادت میں وہ سب مکان کے ایک کمرے میں جمع ہوتے ہیں۔ وہاں وہ اپنے کپڑے اتار کر عجیب و غریب



لباس پہن لیتے ہیں اور مختلف رنگوں سے اپنے چہرے کا میک اپ کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی پراسرار ڈرامے میں حصہ لینے کی تیاری کر رہے ہیں۔ لڑکیاں نیم عریاں لباس میں ہیں وہ خاموش ہیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی جا رہی ہیں۔ لباس کی تبدیلی اور میک اپ سے فارغ ہونے کے بعد کمرے کی بتیاں بجھا دی جاتی ہیں۔ بڑبڑاہٹ کی آواز بتدریج تیز ہوتی جا رہی ہے۔ ناقابل فہم الفاظ پر مشتمل انجانی آوازیں، بہت ساری مکھیوں کی بھنبھناہٹ ——— لہجہ دعائیہ ہے، جیسے بہت ساری بے چین روحیں شانتی کی بھیک مانگ رہی ہیں۔ پھر اچانک تاریک کمرے سے ایک لڑکی کی دل خراش چیخ بلند ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک موم بتی جلا دی جاتی ہے۔ جس کی مدہم مدہم روشنی میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے بہروپ میں شیطان کے چیلے نظر آتے ہیں۔

نوجوان فوجی افسر اپنے دونوں ہاتھوں میں شمع پکڑے ہوئے کمرے سے باہر نکل کر تہہ خانے کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کے پیچھے قطار کی صورت میں لڑکے اور لڑکیاں چل رہی ہیں۔ وہ سب تہہ خانے میں پہنچتے ہیں اور ایک بڑے سے تسلے میں آگ روشن کی جاتی ہے۔ تہہ خانے کے در و دیوار پر جانوروں کی بھیانک شکلیں لٹکی ہوئی ہیں۔ آگ کی روشنی میں پورا تہہ خانہ سرخ رنگ کے سیلاب میں ڈوب جاتا ہے۔ پھر وہ آگ کے گرد تیزی سے چکر لگاتے ہیں اور زور زور سے عجیب و غریب الفاظ دہراتے ہیں۔

پراسرار نوجوانوں کا یہ گروہ دراصل شیطان کا پجاری ہے۔ رات کو ان میں سے ایک آدمی کو اس گروپ کا روحانی رہنما منتخب کیا گیا۔ صبح کی سپیدی پھوٹ چلی تھی، مگر تسلے کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے شعلے اب بھی تہہ خانے کی چھت سے ٹکرا رہے تھے۔

ان دنوں امریکی نوجوانوں میں شیطان کی پوجا کا خبط بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ کیلی فورنیا، اوکلولینیڈ میں جب آسمان پر پورا چاند نمودار ہوتا ہے تو متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لڑکے اور لڑکیاں اپنے جسم سے کپڑے اتار دیتے ہیں اور پھر وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر شیطانی رقص شروع کر دیتے ہیں۔ نیوجرسی میں ۳۰ سالہ ریسیپشنسٹ نے اپنے ایک ہم پیشہ شخص کو خوفزدہ کر کے استعفیٰ دلوانے کے لئے اس کی میز پر سیاہ رنگ کی ایک گڑیا ڈال دی جس کے جسم کے ایک ایک حصے میں کانٹے پیوست تھے۔ مسلسل تین روز تک جب اس شخص کو پراسرار گڑیا ملی تو وہ اس قدر خوفزدہ ہوا کہ ملازمت چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ شکاگو میں ۱۰۰ میں سے ۵، ۷ افراد ایسے ملیں گے جو شیطان کی پوجا کرتے ہیں۔ ان میں ہر قماش کے لوگ شامل ہیں اساتذہ، آفس منیجر، نرس، سماجی کارکن، کیمسٹ، اور کالجوں کے طلبأ اور طالبات۔ یہ لوگ ہر ہفتے یکاں ان کی عبادت گاہ میں جمع ہوتے ہیں اور بڑے پجاری سے جادو اور ٹونے کے متعلق ہدایات حاصل کرتے ہیں۔

امریکہ میں جادو ٹونے سے دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سان فرانسسکو کے ایک کتاب گھر "میٹافزیکل سنٹر" میں اس موضوع پر جتنی کتابیں آتی ہیں۔ ان میں سے ۵، فی صد کتابیں فوراً فروخت ہو جاتی ہیں۔ جادو اور ٹونے پر مبنی ولیم ملیٹی کے ناول نے مقبولیت اور آمدنی کے لحاظ سے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔

۱۹۶۸ء میں "روزمیری بے بی" نام کی فلم تیار ہوئی تھی۔ یہ فلم جادو ٹونے پر اعتقاد رکھنے والے امریکیوں میں آج بھی روز اول کی طرح مقبول ہے۔ فلم اور کتابوں کے علاوہ امریکہ کے کئی کالجوں میں "ویچ کرافٹ" پر کلاسیں لی جاتی ہیں۔ سینکڑوں طلبا، ذوق و شوق سے اس موضوع پر تعلیم حاصل کرتے ہیں اور پھر شیطان کے چیلوں میں عملی طور پر شریک ہو جاتے ہیں۔

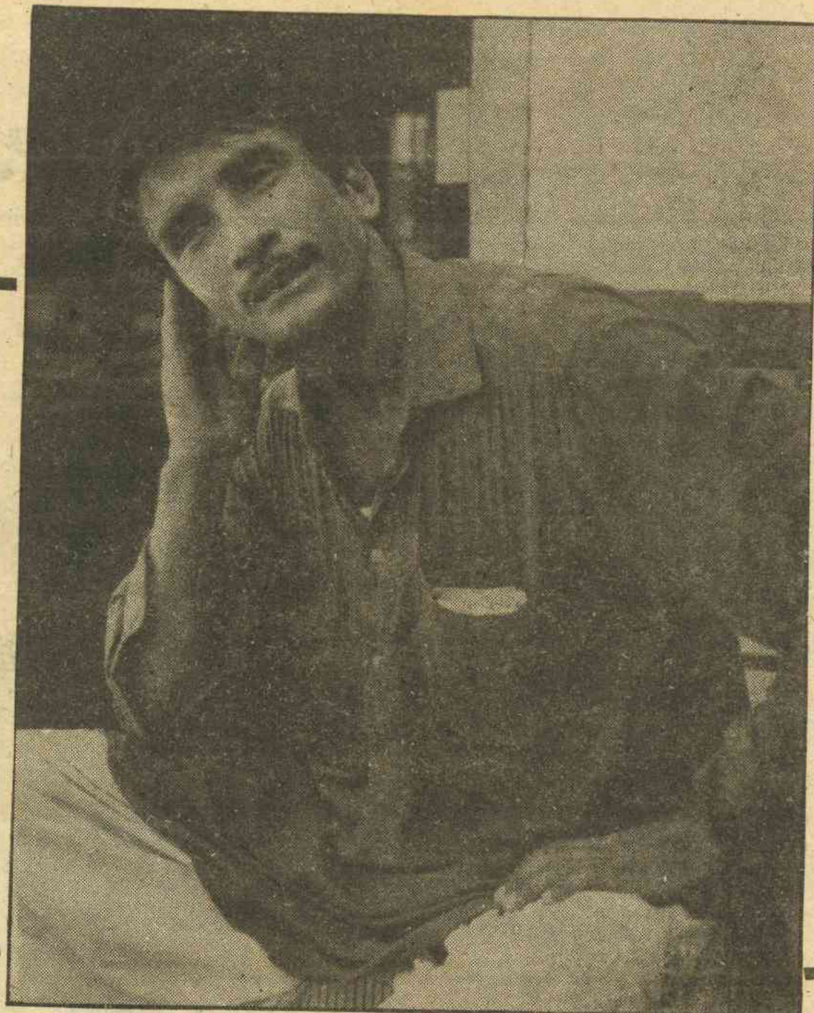
امریکہ کے علاوہ برطانیہ اور مغربی جرمنی میں بھی جادو ٹونے کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک جرمنی صحافی نے سروے کرنے کے بعد انکشاف کیا ہے کہ کم سے کم تین لاکھ جرمن کسی نہ کسی صورت میں تقریباً سات لاکھ روپے چندے اور امداد کی صورت میں جادو اور ٹونے پر خرچ کرتے ہیں۔ خفیہ تنظیمیں باقاعدہ پجاریوں اور ہمدردوں سے چندہ وصول کرتی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں بھی شیطان کے پجاری موجود ہیں۔ چند سال پیشتر اس گروہ کے افراد نے ایک لڑکی کو اذیت دے کر ہلاک کر دیا تھا۔

ویچ کرافٹ

انسان کی خواہشات لامتناہی ہیں۔ وہ کائنات کی ہر چیز کو اپنے تصرف میں لانا چاہتا ہے۔ بے پناہ طاقت اور اختیارات کا سرچشمہ بننے کی خواہش میں وہ علم سیکھتا ہے۔ اور تجربوں کے ذریعہ قادر مطلق بن کر پوری دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی یہی خواہش اسے جادو ٹونے اور ویچ کرافٹ کی طرف کھینچ کرلے جاتی ہے۔ اس عقیدے کے ماننے والوں کو یقین ہے کہ

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

زیب تن ٹیکسٹائل لیبر یونین کے صدر
باور خان سے نعیم الحسن کی ایک ملاقات



ہماری جد وجہد
بتائے گی کہ
وفادار کون
اور ملک دشمن
کون ہے؟

مزدور کسی سیاسی جماعت کا آلۂ کار نہیں ہے

"زیب تن کے مزدوروں کو چار ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ مزدور بے چین اور پریشان تھے۔ انہیں پچھلے سال کا بونس بھی نہیں دیا گیا۔ سیٹھ، ملز سے غائب تھا۔ وہ مزدوروں کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔ مزدوروں کی چیخ و پکار پر وہ ساڑھے تین بجے ملز میں آیا اور دس تاریخ کو تنخواہ دینے کا وعدہ کیا۔ مزدوروں نے کہا کہ "چلو جہاں چار مہینے گزر گئے وہاں چار پانچ روز اور قرض پر زندگی گزار لیں گے" چنانچہ تین بجے والی شفٹ کے مزدور اندر چلے گئے اور اس سے پہلی شفٹ کے مزدور اپنا کام ختم کر کے کارنج کمپنی کے راستے اپنے گھر جا رہے تھے۔

جگہ جگہ پولیس کے ٹرک اور گاڑیاں کھڑی تھیں مسلح پولیس نے مورچہ بندی کر رکھی تھی۔ ڈی ایس پی نور خان اور سائٹ تھانے کے ایس ایچ او شیر باز خان کھڑے تھے۔ انہوں نے جو جال بچھایا تھا اس سے مزدور بے خبر تھے۔ اچانک فائرنگ کا حکم دے دیا گیا۔ اس سے قبل اتنی زیادہ شیلنگ کی گئی کہ چاروں طرف دھواں بھر گیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے مزدور اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے۔ آنکھ بند کر کے گولیاں برسائی جا رہی تھیں پولیس والے تاک تاک کر نشانے لگا رہے تھے۔ زیب تن کے مزدور محمد شعیب کو گولی لگی اور وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ زیب کا دوسرا مزدور پائندہ محمد بھی پولیس کی گولی سے شہید ہو گیا۔ پولیس والے ہمارے اس ساتھی کی لاش چرانے میں کامیاب ہو گئے مگر مزدوروں نے محمد شعیب کی لاش حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا دی اور کامیاب ہو گئے" —— زیب تن ٹیکسٹائل ملز لیبر یونین کے صدر باور خان نے ۷ جون کی فائرنگ کا لرزہ خیز واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا —— "مزدوروں کے خلاف اتنی بڑی کارروائی کی مثال پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔"

باور خان نے بتایا کہ جب سلطان انڈسٹریز اور زیب تن کے مزدوروں پر فائرنگ کی جا رہی تھی اس وقت وہ ملز میں تھے جب انہیں فائرنگ کی اطلاع ملی تو وہ بھاگتے ہوئے اس جگہ پہنچے۔ دیکھا تو چاروں طرف شیلنگ اور فائرنگ ہو رہی ہے۔ نہتے مزدور جنہیں خبر نہ تھی کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ اس آفت میں گھرے ہوئے اپنے شہید ساتھیوں کی لاشیں حاصل کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ اب تک دو مزدور شہید اور پانچ مزدور شدید زخمی ہو چکے تھے۔ اسی دن مزدور شعیب شہید کی لاش اٹھا کر لے جانا چاہتے تھے۔ عوام اور حکومت

لاش اٹھانے والے پولیس کی گولی کا نشانہ بن رہے تھے

کو بتانا چاہتے تھے کہ ان پر کتنا بڑا ظلم کیا گیا تھا مگر موقع پر موجود حکام انہیں کسی صورت سے اس بات کی اجازت دینا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اپنے ظلم پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے ابھی مزدور فرنٹیئر کالونی کے بس اسٹاپ پر پہنچے ہی تھے کہ پرامن اور سوگوار مزدوروں پر دوبارہ فائرنگ اور شیلنگ شروع کر دی گئی۔ اس اندھا دھند فائرنگ کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ایک بچہ اور ایک عورت ہلاک ہو گئی۔ ایک گدھا بھی ہلاک ہو گیا۔

بادر خان نے بتایا کہ شہید شعیب کے جنازے میں عثمان بلوچ اور نبی احمد موجود تھے۔ میں بھی وہیں تھا جنازے کو کندھا دینے والے ہمارے دو ساتھی گولی لگنے سے شہید ہو چکے تھے۔ مزدور اپنے ساتھی کی لاش اٹھانے کی کوشش کرتے تو وہ بھی پولیس کی گولی کا نشانہ بن جاتے۔ اور ان کا جسم تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو جاتا۔ پولیس والوں میں شاید بازی لگی تھی کہ کون کتنے مزدور ہلاک کرتا ہے ـــــ پولیس کی بکتر بند گاڑیوں نے مزدور بستیوں کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ مسلح پولیس نے جگہ جگہ مورچہ بندی کر رکھی تھی اور وہ گولیاں برساتے ہوئے دندناتے پھر رہے تھے۔ وہ سرحد عبور کر کے دشمن ملک میں گھس آئے تھے۔"

بادر خان نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ کچھ لوگوں نے تحقیقات کے بغیر ہی ہم پر بھارت اور روس کے ایجنٹ کا الزام عائد کر دیا! یہ الزام انتہائی گمراہ کن ہے۔ کہا گیا کہ ہمارے پاس اسلحہ آ رہا ہے۔ اگر ہمارے پاس اسلحہ ہوتا تو گولی کا جواب گولی سے دینے میں کونسی چیز مانع تھی۔ بھٹو صاحب اور ایسے دوسرے لوگ جو ہم پر ایجنٹ ہونے کا الزام لگاتے ہیں' انہیں تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ مزدور کسی کا ایجنٹ نہیں ہوتا اور مزدور سے بڑھ کر کوئی دوسرا طبقہ ملک کا وفادار نہیں ہو سکتا۔

دنیا بھر کی تاریخ کو الگ رکھ دیجئے، خود اس ملک کی تاریخ دیکھ لیں۔ اس ملک کے محنت کشوں نے ہر مشکل وقت میں وطنِ عزیز کے لیے قربانیاں دیں۔ برصغیر میں پاکستان بنانے والے یہی مزدور ہیں۔ تاریخ کے کس موڑ پر مزدوروں نے ملکی مفادات سے غداری کی؟ اس کا ایک بھی ثبوت پیش کریں ـــــ نہیں ہرگز نہیں ـــــ ایسی ایک بھی مثال نہیں ملے گی ـــــ ہاں ـــــ مزدوروں کو غدار، دشمن کے ایجنٹ اور شرپسند کہنے والوں کے بارے میں غداری، ملک دشمنی اور وطن فروشی کی بے شمار مثالیں مل جائیں گی۔

بادر خان مزدور ہیں، نوجوان ہیں، لہجہ اکھڑ ـــــ ـــــ گفتگو کے اس حصے میں وہ خاصے جذباتی ہو گئے سرمایہ داران کے چہرے کی سرخی چوس لینے میں ابھی کامیاب نہیں ہو سکا ہے، اس الزام پر ان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا، انہوں نے کہا ـــــ "ہماری جدوجہد بتائے گی اور تاریخ فیصلہ کرے گی کہ ملک کا وفادار کون ہے اور ملک دشمن لوگ کون ہیں؟"

انہوں نے کہا کہ یہ ایک خالص مزدور تحریک تھی۔ دس روزہ ہڑتال اور مزدوروں کے نظم و ضبط نے ثابت کر دیا کہ آج کا محنت کش طبقہ کتنا منظم اور باشعور ہے۔ اس کی لڑائی اپنی لڑائی ہے۔ وہ کسی سیاسی جماعت کا دُم چھلا نہیں ہے۔ اس کی جدوجہد پاکستان کے تمام پسے ہوئے مظلوم طبقات کی جدوجہد ہے۔ اور دنیا بھر کے محنت کشوں کی عظیم انقلابی جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ سازش تو سرمایہ داروں نے کی تھی جو مزدوروں سے کہتے تھے کہ کارخانے نہیں چلیں گے، ملیں بند رہیں گی مزدوروں کو گھر بیٹھے اجرت ملے گی۔ حکومت ہم پر سازش کا الزام لگاتی ہے، وہ تحقیقات کرائے کہ صنعت کار ایسا کیوں چاہتے ہیں؟ وہ کارخانے کیوں بند رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ مزدوروں میں جان بوجھ کر صنعتی بے چینی اور بے اطمینانی پھیلانے کی کیوں کوشش کر رہے ہیں؟ "عوامی حکومت" اور عوامی حکومت کے "عوامی صدر" کو مزدوروں پر ایجنٹ کا الزام لگانے سے قبل اس پہلو پر اچھی طرح سے غور کر لینا چاہیئے۔ سرمایہ دار چاہتے تھے کہ ہم ہڑتال جاری رکھیں۔ انہوں نے نوکر شاہی سے ملی بھگت کر کے ساری تیاریاں کر لی تھیں۔ وہ اس ہڑتال کی آڑ میں مزدوروں کی منظم طاقت کو وقت سے پہلے کچلنے کی فکر میں تھے۔

بادر خان نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ہڑتال ختم ہونے کے بعد بھی حالات ویسے ہیں۔ زیب تن ٹیکسٹائل ملز، ہارون ٹیکسٹائل ملز اور دوسری ملوں میں ہڑتال کے دنوں کی اجرت دینے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ مزدوروں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اتنے دنوں کی اجرت حکومت سے طلب کریں۔ چند روز پیشتر گتّے کے کارخانے سے آٹھ مزدوروں کو برطرف کر دیا گیا۔ برطرفیوں کا سلسلہ جاری ہے اور جانے کب تک جاری رہے۔

انہوں نے میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مزدوروں پر پروڈکشن میں کمی کرنے کا الزام بھی بے بنیاد ہے۔ دراصل سرمایہ دار معمول کی پیداوار میں کمی کر کے مزدوروں کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ زیب تن ٹیکسٹائل ملز میں پہلے روئی کی ساٹھ گانٹھیں دی جاتی تھیں اب ان

باقی صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ فرمائیں



نعیم الحسن، بادر خان سے انٹرویو لے رہے ہیں

لانگ مارچ کے دوران صدر ماؤ کے ساتھ - ۲

صدر ماؤ نے ایک زخمی نوجوان کو بچانے کیلئے اپنی جان کی بازی لگادی



’کامریڈو، حوصلہ بلند رکھو، فتح ہماری ہوگی‘

چھن چھانگ فنگ

ترجمہ
احفاظ الرحمٰن

اس سے پہلے کہ صدر ماؤ کچھ کہتے ان کا سائیس اُن کے گھوڑے کی رکاب تھامے اُسے پُل کی طرف لے گیا۔ جب گھوڑے کا پاؤں ناہموار تختے پر پڑا اور اُسے لوگوں کا شور سنائی دیا تو وہ بھڑک اٹھا اور دہشت زدہ ہوکر ہنہنانے لگا۔

صدر ماؤ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے پُل کی طرف گئے۔ ”اسے ابھی رہنے دو۔“ انہوں نے پکار کر سائیس سے کہا۔ ”پہلے کامریڈوں کو پار کر لینے دو۔“

”اس پر آپ کے کپڑے اور دوسرا سامان لدا ہوا ہے۔“ سائیس نے پکار کر جواب دیا۔

ہمیں معلوم تھا کہ یہ بات کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر گھوڑے کو نہ لے جایا جاتا تو صدر ماؤ کو اس رات کوئی بستر نصیب نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم نے سائیس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا: ”اسے دھیرے دھیرے آگے بڑھنے دیجئے، جناب صدر“

”اگر وہ ہمیں اس پار نہ ملا تو یہ بڑی پریشان کن بات ہوگی۔“

صدر ماؤ نے بڑی نرم لیکن کڑی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ ”چھن چھانگ فنگ گھوڑے کو واپس لانے میں سائیس کی مدد کرو۔“ انہوں نے کہا۔

”پہلے فوجیوں کو گذر جانے دو۔“

سپاہی گھوڑے کو چمکارتے ہوئے اُسے آگے بڑھانے میں سائیس کی مدد کر رہے تھے۔ مجھے گھوڑے کو واپس لانے کے لئے دوڑ کر پل کا آدھا حصہ طے کرنا پڑا۔

جب ہم اسے کنارے لے آئے تو دیکھا کہ صدر ماؤ سپاہیوں کو تیزی سے پل پار کرنے کی ہدایت کر رہے ہیں۔ جب آخری سپاہی بھی پار چلا گیا، تب کہیں جاکر ہم نے صدر ماؤ کی معیت میں پل پر قدم رکھا۔

اس رات ہم موسیمین پہنچ گئے۔ صدر ماؤ نے ہم سے کہا۔ ”یاد رکھو خواہ کوئی بھی جگہ ہو اور کوئی بھی وقت ہو، ہمیں ہمیشہ اپنے فوجیوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر محض ایک گھوڑے کی خاطر کامریڈوں کے مارچ میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو یہ ایک بہت بُری بات ہوگی!“

وہاں سے رخصت ہونے کے بعد ہم صدر ماؤ کے ساتھ لوتنگ پہنچے۔ آنشن چھانگ کے مقابلے میں یہاں دریا کا پاٹ نسبتاً کم چوڑا تھا لیکن بہاؤ کی رفتار زیادہ تیز تھی۔ دونوں کناروں پر عمودی چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ پل لوہے کی تیرہ موٹی زنجیروں پر مشتمل تھا۔ جو دونوں کناروں پر چٹانوں میں گڑی ہوئی بڑی بڑی میخوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ پل کے دونوں طرف لگی ہوئی زنجیریں ہاتھ کا کام دیتی تھیں۔

لوتنگ میں ہماری کامریڈ لیو پالو اور دوسرے رہنماؤں سے ملاقات ہوئی وہ صدر ماؤ کو ایک بڑے گرجا کے سامنے ایک ایسی جگہ لے گئے جہاں سے وہ گردو نواح کا اچھی طرح جائزہ لے سکتے تھے۔ اس کے بعد ہم صدر ماؤ کے ساتھ پُل کی طرف گئے۔

پہلے ان زنجیروں پر تختے بچھے ہوئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ہمارا اگلا یونٹ پل پر قبضہ کرتا، دشمن نے انہیں آگ لگاکر تباہ کر دیا تھا۔ میں اوپر چڑھ کر ان زنجیروں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان میں سے ایک پیالے جتنی موٹی تھی۔ تمام تختے جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ نیچے دریا کی لہریں شور مچا رہی تھیں۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ صدر ماؤ نے میری اس کیفیت کو محسوس کر لیا۔ انہوں نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ڈر گئے؟“

”نہیں۔“

وہ پل کو پار کرنے لگے، ہم سب اُن کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ میں انہیں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی سبک روی اور

صدر ماؤ کے گرد دھوئیں کا بادل پھیلا ہوا تھا

اُسانی سے ساتھ چل رہے تھے۔ انہوں نے دونوں کناروں پر کھڑی ہوئی چٹانوں کی طرف دیکھا جو آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ دریا کی شور مچاتی لہریں بھی ان کے خیالات کا سلسلہ منقطع نہ کر سکیں۔ چونکہ پل پر بڑی بھیڑ بھاڑ تھی۔ اس لئے جب ہم اس کے بیچ میں پہنچے تو وہ جھولنے لگا۔ میں نے زنجیر کو پکڑ لیا اور چلتے چلتے رک گیا۔ صدر ماؤ نے میری طرف مڑتے ہوئے کچھ کہا جسے میں سن نہ سکا۔ گرجتے ہوئے دریا کی آواز پوری فضا پر چھائی ہوئی تی۔ غالباً انہوں نے یہی پوچھا ہو گا کہ کیا میں دقت محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا وہ رکے اور میرا ہاتھ پکڑ کر آگے کی طرف بڑھنے لگے۔

میں نے لمحے بھر کے لئے نیچے کی طرف دیکھا۔ دریا کی غضب ناک لہریں لمبی لمبی تلواروں کی طرح پل کے سینے میں گھسی جا رہی تھیں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے نظریں اٹھا کر اپنے کامریڈوں کی طرف دیکھا جو پل پر چل رہے تھے۔ بعض بڑی احتیاط سے قدم پھونک پھونک کر چل رہے تھے۔ بعض زنجیروں کے سہارے دھیرے دھیرے آگے کی طرف کھسک رہے تھے۔ دوسرے قطار کی صورت میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے غپ شپ کرتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے چل رہے تھے۔

صدر ماؤ جواب بھی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، وقتاً فوقتاً مڑ کر پیچھے آنے والوں کی طرف دیکھ لیتے۔ بعض اوقات وہ رک کر اپنا ہاتھ لہرا دیتے یا ان سے ایک دو باتیں کر لیتے۔ آخر کار ہم نے پل کو پار کر لیا۔

"جناب صدر!" دوسرے کنارے پہنچ کر میں نے ان سے سوال کیا۔ "ہم ایک سکواڈ سے اس جیسے پل کو طویل عرصے تک اپنے قبضے میں رکھ سکتے ہیں، لیکن دشمن ..... "

صدر ماؤ ہنس پڑے۔ "دشمن، دشمن ہے۔ ان کی فوج کا مقابلہ ایک ایسی فوج سے نہیں کیا جا سکتا، جس کی رہنمائی کمیونسٹ پارٹی کرتی ہے، ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے!" ہم سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔

شوئی سیلنی جانے والی سڑک پر

دریائے توتو کو عبور کرنے کے بعد ہم نے چند روز ہوانگ ینگ میں قیام کیا اور اس کے بعد شوئی سیلنی کی طرف روانہ ہو گئے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ہم ایک دن کے اندر اندر وہاں پہنچ جائیں گے۔

ہم صبح کے وقت روانہ ہوئے۔ صدر ماؤ بہت مصروف تھے۔ اس لئے وہ مرکزی کمیٹی کی تنظیموں کے ساتھ نہ جا سکے، اور انہوں نے بعد میں میڈیکل یونٹ کے ساتھ سفر کیا۔ گارڈوں کے اسکواڈ کے لیڈر کامریڈ ہو چانگ پاؤ اور میں ان کے ساتھ تھے۔

جب ہم ایک پہاڑ کے پاس پہنچے، جس کی چوٹی نیچے سے تقریباً چھ لی کے فاصلے پر تھی، تو دشمن کے طیارے ہماری طرف غوطے لگانے لگے۔ ہم ادھر ادھر بکھر گئے لیکن مارچ کرتے رہے۔ ہو صدر ماؤ کے آگے آگے چل رہا تھا اور میں ان کے پیچھے تھا۔ صدر ماؤ کی نظریں سڑک پر گڑی ہوئی تھیں، جیسے وہ کسی سوال کا حل سوچ رہے ہوں۔ بس کبھی کبھار وہ طیاروں کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ باقی لوگ بہت بے چین سے تھے۔

طیاروں نے غوطہ لگایا اور اس رُخ پر چلے گئے جہاں سے ہم آئے تھے۔ ابھی ہم نے ذرا سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ اوپر اور پیچھے کی طرف سیٹیاں سی گونجنے لگیں۔ مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ یہ بموں کے دھماکے ہیں۔

"جناب صدر!" میں ان کی طرف جھپٹتے ہوئے زور سے چلایا۔

ابھی میں چند قدم ہی دوڑا ہوں گا کہ میرے سامنے اور ایک پہلو کی طرف ایک ساتھ بہت سے بم پھٹے۔ بموں کے دھماکے اتنے شدید تھے کہ میں زمین پر آ گرا۔ صدر ماؤ کے گرد دھوئیں کا بادل پھیلا ہوا تھا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا اور رینگتا ہوا ان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ دوزانو بیٹھے ہوئے ہو چانگ پاؤ کے اوپر جھکے ہوئے تھے جو زخمی ہو گئے تھے۔ صدر ماؤ زخمی نہیں ہوئے تھے۔ میرا دل جو زور زور سے دھڑک رہا تھا آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگا۔ میں نے مشینی انداز میں اپنے ابروؤں سے پسینہ اور گرد پونچھا اور صدر ماؤ کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ ہو کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ ہو اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھ سے تھامے لیٹے ہوئے تھے۔

وہ سب جدا ہونے والے ہیرو کو آخری سلام کہہ رہے تھے

ان کی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے جھلملا رہے تھے لیکن ان کے منہ سے ایک کراہ تک نہیں نکلی۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ اتنے میں طبی اردلی ہماری طرف دوڑتا ہوا آیا۔

"جلدی کرو" صدر ماؤ نے اس سے کہا۔ "ان کا معائنہ کرو!"

ہو نے انکار میں اپنا ہاتھ ہلایا۔ "جناب صدر، میں اب بچ نہیں سکتا۔ دوا کو محفوظ رکھئے۔ آپ لوگوں کو اس کی ضرورت پڑے گی۔ ان کا شہابی چہرہ بالکل زرد پڑ گیا۔

"تمہارا زخم خطرناک نہیں ہے۔ تم اچھے ہو جاؤ گے" صدر ماؤ نے ان کو تسلی دینے کے لئے کہا۔ وہ پھرتی کے ساتھ ہو کے زخموں پر پٹیاں باندھنے میں طبی اردلی کی مدد کرنے لگے۔ پھر وہ بیٹھ گئے اور انہوں نے ہو کا سر اپنے بازوؤں پر رکھ لیا۔ جیسے کوئی بچے کو سلاتا ہو۔ "تم اچھے ہو جاؤ گے۔ حوصلہ رکھو" انہوں نے شفقت سے کہا۔ "ہم تمہیں شوئی سیلنی لے چلیں گے۔ وہاں ڈاکٹر تمہارا علاج کرے گا اور تم بہت جلد ہلکے پھلکے ہو جاؤ گے۔"

ہو نے اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں سے بڑی محبّت کے ساتھ صدر ماؤ کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ یہ سن کر بہت پریشان ہو گئے تھے کہ ہم انہیں اٹھا کر لے جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بڑی دقت سے اٹک اٹک کر کہا: "جناب صدر، کوئی فائدہ نہیں۔ پیٹ کے اندر تمام خون بہہ چکا ہے۔ مجھے اس بات کا کوئی دکھ نہیں کہ میں مر رہا ہوں۔ مجھے صرف اس بات کا دکھ ہے کہ میں آپ کے ساتھ شمالی شینسی جا کر اپنے اڈے کا علاقہ نہیں دیکھ سکتا۔ ان کی آنکھوں کے کونوں سے آنسوؤں کے دو قطرے جھلملاتے ہوئے نیچے گر پڑے۔

ان کی سانس میں لمحے بھر کے لئے ہچکچاہٹ سی پیدا ہوئی جیسے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہو۔ پھر انہوں نے کہا: "میرے والدین، چیان، چیانگ شی میں رہتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو از راہ کرم انہیں میری موت کی خبر پہنچا دیجئے گا۔"

صدر ماؤ نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور ان کے جسم کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ان کے اور قریب ہو گئے۔

"آپ اچھے ہو جائیں گے۔" طبی اردلی اور میں نے ان کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ ہمارے ساتھ شمالی شینسی چلیں گے"۔

ہو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "کامریڈ چھین" ان کے منہ سے الفاظ اٹک اٹک کر نکل رہے تھے۔ "اب میں صدر ماؤ کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ تم ان کی اور مرکزی کمیٹی کے دوسرے لیڈروں کی اچھی طرح حفاظت کرنا۔"

ان کی آواز اتنی مدہم تھی کہ میں بمشکل سن سکتا تھا۔ آخر کار انہوں نے بڑی دشواری کے ساتھ اپنا سر اٹھایا اور صدر ماؤ اور ہماری طرف نظریں جما دیں۔ جب وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے تو ان کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ "انقلاب ـــــ کو ـــــ

فتح —— حاصل —— ہو گی!" پھر انہوں نے اپنی آنکھیں موندلیں۔ ——

طبی اردلی اور میں نے پاگلوں کی طرح انہیں آوازیں دیں لیکن وہ سدھار چکے تھے۔ ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ پڑے۔

صدر ماؤ نے آہستہ سے ہو کی گردن کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالا اور ان کے جسم کو بڑی نرمی سے نیچے رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے بڑی مدھم آواز میں مجھ سے کہا۔ "چادر!"

میں نے انہیں چادر پکڑا دی، جسے میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ انہوں نے اسے کھولا اور دھیرے سے کامریڈ ہو کے جسم کو اس سے ڈھانپ دیا۔

اس دن ہوا ساکت تھی۔ پہاڑ پر گھاس اور درخت خاموش کھڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے جدا ہونے والے ہیرو کو آخری بار سلام کر رہے ہوں۔ ہم نے اپنے آنسو پونچھے اور انہیں دفن کر دیا۔ اس کے بعد ہم نے صدر ماؤ کے ساتھ پھر اپنا سفر شروع کر دیا۔



"انقلاب کو فتح حاصل ہو گی"

برف پوش پہاڑوں اور گھاس کے میدانوں میں

جون ۱۹۳۵ء میں دریائے تاتو کو پار کرنے کے بعد ہم چھیا چھن پہاڑ کے دامن میں پہنچے جو ایک فلک بوس پہاڑ ہے اور ہر وقت برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ جون کا سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس اونچے برف پوش پہاڑ کے سامنے اس کی تپش دم توڑ چکی تھی۔

ہم نے اس کے دامن میں ایک دن قیام کیا۔ جب ہم اس پہاڑ پر ایک درے سے گزر رہے تھے تو صدر ماؤ نے ہمیں یہ ہدایت کی کہ ہم سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے ادرک اور مرچیں جمع کر لیں۔ اگلے دن ہم نے صبح سویرے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔

چھیا چھن کی چوٹی جس پر سورج کی کرنیں چمک رہی تھیں کسی تلوار کی طرح آسمان کے سینے میں گڑی ہوئی تھی اور اس طرح چمک رہی تھی۔ جیسے اس میں جابجا لاکھوں آئینے جڑے ہوتے ہوں۔ اس کی روشنی سے ہماری آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے برف کے بادل چھتریوں کی طرح اس کے گرد منڈلانے لگتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کسی دوسری دنیا کی پریوں کے دیس کا منظر ہو۔

شروع میں برف زیادہ گہری نہیں تھی اور ہم اس پر بڑی آسانی سے چل سکتے تھے۔ لیکن تقریباً بیس منٹ کی مسافت کے بعد، جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، برف گہری ہوتی گئی۔ بے احتیاطی سے اٹھایا ہوا ایک قدم بھی ہمیں کسی گلیشیر کی دراڑ میں گرا سکتا تھا۔ جہاں سے نکالنے میں ہمیں گھنٹوں لگ جاتے۔ جہاں برف کم گہری تھی، وہاں پھسلن زیادہ تھی۔ ہم ایک قدم آگے بڑھاتے تو پھسل کر تین قدم پیچھے چلے جاتے۔ صدر ماؤ ہمارے آگے آگے چل رہے تھے۔ ان کے کندھے نیچے کو جھکے ہوئے تھے اور چڑھائی چڑھتے وقت انہیں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بعض اوقات وہ پھسل کر کئی قدم پیچھے چلے جاتے۔ پھر ہم آگے بڑھ کر ان کو اپنے ہاتھ کا سہارا دیتے۔ لیکن خود ہمیں بھی پاؤں جمانے میں بڑی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ ہمارے بازو کو اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں لے کر ہمیں اوپر کی طرف کھینچ لیتے۔ ان کے جسم پر ایک ہی روئی دار کپڑا انہیں تھا جلد ہی ان کا خاکی رنگ کا پتلون بھیگ گیا اور سیاہ رنگ کے کپڑے کے جوتوں پر برف کے ذرات چپکنے لگے۔

مسلسل چڑھائی سے ہم نڈھال ہو چکے تھے۔ میں بصد مشکل ان تک پہنچا اور بولا۔

"جناب صدر! آپ کے لئے یہ بڑا محنت طلب کام ہے۔ ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم آپ کو سہارا دیں۔" میں ان کے پہلو میں مستعد کھڑا ہوا تھا لیکن انہوں نے مختصر سا جواب دے کر ٹال دیا۔

"نہیں تم لوگ بھی میری طرح تھکے ہوئے ہو!" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔

ہم آدھی چڑھائی چڑھ چکے تھے کہ اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ پہاڑ کے اوپر گھنے سیاہ بادل اور امڈ آئے۔ ہوا کے تیز جھکڑوں میں برف کے ذرات مجنونانہ انداز میں ہمارے اردگرد ناچنے لگے۔

میں تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا صدر ماؤ کے پاس پہنچا اور ان کی جیکٹ کو پکڑ کر چلایا "جناب صدر، برف کا طوفان آرہا ہے!"

انہوں نے ہوا کے مخالف رُخ پر دیکھا۔ "ہاں یہ کسی بھی لمحے ہمیں آلے گا، ہمیں تیار رہنا چاہئیے۔" ابھی ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ چھوٹے چھوٹے انڈوں جتنے بڑے اولے سیٹیاں بجاتے ہوئے ہم پر گرنے لگے۔ برف باری اور ژالہ باری کے اس مہیب سمندر میں ہماری چھتریاں کیا حقیقت رکھتی تھیں۔ ہم نے موم جامے کی ایک مضبوط چادر اپنے اوپر تان لی اور صدر ماؤ کے گرد گھیرا باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ طوفان اتنی شدت کے ساتھ گرج رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا، آسمان ابھی نیچے گر پڑے گا۔ لوگوں کی ملی جلی چیخ و پکار، گھوڑوں کی ہنہناہٹوں اور بجلی کی کان پھاڑ گھن گرج کے علاوہ کچھ نہیں سنائی دیتا تھا۔ اتنے میں اوپر کی طرف سے ایک بھاری بھرکم آواز گونجی۔

"کامریڈو، حوصلے بلند رکھو! ڈٹے رہو! استقلال کا مطلب ہے فتح!" میں نے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ درے کی چوٹی پر سرخ جھنڈے لہرا رہے تھے۔ میں نے استفہامیہ انداز میں صدر ماؤ کی طرف دیکھا۔!

"وہاں سے ہمیں کون پکار رہا ہے؟"

"یہ پروپیگنڈہ ٹیم کے کامریڈ ہیں۔" صدر ماؤ نے جواب دیا "ہمیں ان سے سیکھنا چاہئیے۔ وہ اٹل جذبوں کے مالک ہیں!"

برف کا طوفان جس تیزی سے نمودار ہوا تھا، اسی تیزی سے ختم ہو گیا۔ اور دیکھتے دیکھتے آسمان پر سرخ دہکتا ہوا سورج

”بموں کے دھماکے میں ہم مارچ کرتے رہے“

ابھر آیا۔ صدر ماؤ موم جامے کی پناہ گاہ سے نکل کر برف سے ڈھکی ہوئی ڈھلان پر کھڑے ہو گئے۔ برف کے اکا دکا گالے اب بھی ان کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔

”ہاں، تو ہم کس طرح اس لڑائی سے عہدہ برآ ہوئے۔“ انہوں نے دریافت کیا ”کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟“

کسی کو چوٹ نہیں آئی تھی۔ البتہ لاؤ یو اپنے گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے ان کے پاس پہنچا اور بولا۔ ”ایک اولے کی ضرب سے میرا بازو سوج گیا ہے۔!“

صدر ماؤ نے فوراً جینگ فو چھانگ کو بلا کر اسے لاؤ یو کے بازو پر مرہم لگانے کی ہدایت کی۔ لیکن لاؤ یو نے مسکراتے ہوئے کوئی مدد لینے سے انکار کر دیا اور اپنے گھوڑے کی باگ تھامے آگے بڑھ گیا۔ میں اس وقت شینگ شین چی کے ساتھ چل رہا تھا میں نے اُسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

”کہو بیارے، کیسی گزری؟“

اس نے صدر ماؤ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اگر وہ اسے برداشت کر سکتے ہیں تو ہم بھی کر سکتے ہیں!“ پھر اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا جو برف میں گہرائی تک گھسے ہوئے تھے اور مزاحیہ انداز میں کہنے لگا۔ ”ذرا اس چیز کو تو دیکھو اس نے میرے پاؤں کو گرفتار کر لیا ہے۔“ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سردی نے ہمارے پاؤں سُن کر کے رکھ دیئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پاؤں کہیں غائب ہو گئے ہیں۔

جوں جوں ہم اوپر بڑھتے گئے، چڑھائی اور بھی مشکل ہوتی گئی۔ جب ہم پہاڑ کے دامن میں تھے تو مقامی لوگوں نے ہمیں بتایا تھا ——

”جب تم پہاڑ پر پہنچو تو ہنسنے اور بات کرنے سے پرہیز کرنا، ورنہ پہاڑ کا دیوتا گلا گھونٹ کر تمہیں مار ڈالے گا۔“ ہم لوگ توہم پرست نہیں تھے، پھر بھی ان کی اس بات میں ایک تلخ، ناخوش گوار حقیقت پنہاں تھی۔ میرے لئے سانس لینا مشکل ہو گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرا سینہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ دل کی دھڑکن بہت تیز ہو گئی تھی اور ہنسنا تو درکنار میرے لئے بات کرنا مشکل ہو گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اگر میں نے بات کرنے کے لئے مُنہ کھولا تو میرا دل مُنہ سے اچھل کر باہر گر پڑے گا۔ میں نے ایک بار پھر صدر ماؤ کی طرف دیکھا۔ وہ آندھی اور برفباری سے بے نیاز مضبوطی سے قدم رکھتے ہوئے ہمارے آگے آگے چل رہے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی سے پروپیگنڈہ ٹیم نے ایک بار پھر پکار کر کہا۔

”کامریڈو، بڑھتے رہو! اپنی نظریں آگے کی طرف رکھو! بڑھتے رہو!“

آخر ہم درّے کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ ہر طرف برف کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ تھکن سے چور ہو کر وہیں لیٹ گئے تھے۔ کچھ کامریڈوں کی نظر صدر ماؤ پر پڑی تو وہ پکارتے ہوئے آگے بڑھے ”جناب صدر! یہاں آ کر ذرا آرام کر لیجئے!“

صدر ماؤ نے یہ صورت حال دیکھی تو وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ان کے پاس گئے اور مشفقانہ لہجے میں بولے۔ ”کامریڈو ہم یہاں آرام نہیں کر سکتے۔ ہوا بہت لطیف ہے۔ ایک اور کوشش کرو، تو ہم نیچے دوسری طرف چوتھی فرنٹ آرمی سے جا ملیں گے۔“

ان کے ان الفاظ نے ہمارے دلوں کو گرما دیا اور ہم فوراً ہی ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔ چوٹی کو کامیابی کے ساتھ سر کرنے کی خوشی کے سبب یا شاید کسی اور وجہ سے اچانک میرا سر چکرانے لگا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے پہاڑ میرے پاؤں کے نیچے سے سرک رہا ہو۔ مجھے اپنے جسم پر قابو نہ رہا اور مجھ پر شدید لرزہ طاری ہو گیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا صدر ماؤ کی طرف بڑھتے ہوئے زور سے چلایا۔ ”جناب صدر......!“ اور دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ میرے حواس پوری طرح معطل نہیں ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ صدر ماؤ مجھے اپنے بازو کا سہارا دے رہے ہیں اور مجھے میرا نام لے کر پکار رہے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں فضا میں تیر رہا ہوں۔ مجھے سانس لینے اور بات کرنے میں بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اڑتے ہوئے برف کے گالے میرے چہرے سے ٹکرائے جس سے مجھے ہوش آ گیا اور میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ بہت سے کامریڈ میرے ارد گرد جمع تھے اور حیران تھے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں نے سنا۔ صدر ماؤ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ ”کیا ہو گیا تھا؟ اب تو بالکل ٹھیک ہو نا؟“ میں نے اپنی قوت کو مجتمع کیا اور ہم سب آگے کی طرف چل پڑے۔

ہر قدم پر صدر ماؤ کے پاؤں گہری برف میں ڈوب جاتے تھے۔ انہوں نے مڑ کر ان کامریڈوں کی طرف دیکھا جو ابھی چوٹی پر نہیں پہنچ پائے تھے۔ وہ لوگ بہت آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور ان کی قطار کسی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی چوٹی کی طرف رینگ رہی تھی۔ صدر ماؤ نے ان کا دل بڑھانے کے لئے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرا دیا۔

آندھی کا زور بڑھنے لگا اور سیاہ بادل ایک بار پھر جمع ہونے لگے۔ میں کسی غیر مرئی قوت کی تحریک پر صدر ماؤ کی طرف تیزی سے بڑھا اور زور سے چلایا۔

”جناب صدر، یہاں نہ رکئے، براہ کرم تیزی سے آگے نکل جایئے!“

نیچے اترنا، چڑھنے سے زیادہ آسان تھا۔ لیکن چونکہ پہاڑ کے اس طرف دھوپ نہیں تھی اس لئے یہاں سردی کا زور زیادہ تھا۔ ہم سب نے اپنے وہی باریک سوتی کپڑے پہن رکھے تھے، اور سردی سے



”تمہارا زخم خطرناک نہیں تم اچھے ہو جاؤ گے“



سُرخ فوج نے چھیا چھن کی چوٹی کو سر کر لیا

کانپ رہے تھے۔ میں نے اپنی کمر کے گرد ایک کمبل لپیٹ لیا تھا اور برف سے ڈھکی ہوئی ڈھلانوں پر گرتا پڑتا آگے بڑھ رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم چوتھی فرنٹ آرمی کے کامریڈوں سے جا ملے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں جھنڈے اٹھا رکھے تھے جن پر یہ نعرے لکھے ہوئے تھے۔ ”شمال مغربی سیچھوان کے انقلابی اڈے کو وسعت دو!“ ہمیں اپنے جسموں میں ایک نئی قوت ابھرتی محسوس ہوتی ان کے لئے ہمارے جذبات ان بھائیوں کی طرح تھے جو ایک مدت سے بچھڑے ہوتے ہوں۔

جب ہم آخری ڈھلان سے نیچے اتر رہے تھے تو میں نے مڑ کر اوپر کی طرف دیکھا۔ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر اب بھی سرخ پرچم لہرا رہے تھے۔ پروپیگنڈہ ٹیم کے کامریڈوں کی ولولہ انگیز آوازیں اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

چھیا چھن پہاڑ سے نیچے اترنے کے بعد ہم نے چند روز ماؤ کنگ میں قیام کیا۔ اس کے بعد ہم نے ایک اور برف پوش پہاڑ منگ پی کو پار کیا اور شمال مغربی سیچھوان میں چوکیچی کے مقام پر پہنچ گئے جہاں ہمیں ایک گھاس کے میدان کو پار کرنے کی تیاریاں کرنی تھیں۔ تمام تیاریاں مکمل کرنے کے بعد ہم نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

جب ہم چوکیچی سے رخصت ہوئے تھے تو مطلع بالکل صاف تھا۔ لیکن ابھی ہم نے صرف بیس لی کی مسافت طے کی تھی کہ آسمان پر سیاہ بادل جمع ہونے لگے اور دیکھتے دیکھتے بوندا باندی ہونے لگی۔ ہم ایک ویران پہاڑی علاقے سے گزر رہے تھے، جس کی چٹانوں کی ساخت بڑی عجیب و غریب تھی۔ نوکیلی عمودی چٹانوں اور پتوں سے بھرے ہوئے گڑھوں کے درمیان کوئی چھوٹی سی پگڈنڈی تک نظر نہیں آتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد زور سے بجلی کڑکی اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ پانی کے موٹے موٹے قطروں اور درختوں سے ٹوٹنے والی شاخوں نے بے دردی سے ہم پر یلغار شروع کر دی۔ ہمارے ساتھ ساتھ صدر ماؤ کے کپڑے بھی بُری طرح بھیگ گئے۔

سہ پہر کے چار بجے تک پوری طرح اندھیرا پھیل چکا تھا۔ لگاتار موسلا دھار بارش ہوتی رہی یہاں تک کوئی پناہ گاہ نظر نہیں آتی تھی۔ صدر ماؤ کے گھوڑے پر لگے ہوئے لیمپ میں مٹی کا تیل ختم ہو چکا تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ہم اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتے پھر رہے تھے۔ اس وقت ہمیں روشنی کی کتنی سخت ضرورت تھی!

صدر ماؤ کو راستہ چلنے میں کتنی دشواری پیش آ رہی تھی اور وہ بہت مضمحل سے نظر آتے تھے۔ میں ان کی یہ حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ ذرا سوچئے! جب ہم کہیں پڑاؤ ڈالتے تھے تو دوسرے تو جا کر فوراً سو جاتے تھے، لیکن وہ میٹنگوں میں شرکت کرتے، تاروں کا مطالعہ کرتے، دستاویزات کا خاکہ تیار کرتے اور اسی طرح کے دوسرے کاموں میں مصروف رہتے۔ ان کے اندر کتنی توانائی تھی۔!

”ہمیں یہاں رک جانا چاہیئے!“ جناب صدر! میں نے ان کے سامنے تجویز پیش کی۔

وہ چلتے چلتے رک گئے۔ پھر لمحے بھر سوچنے کے بعد بولے ”ٹھیک ہے۔ ہر شخص کو مطلع کر دو!“

لیکن اب ہمیں ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارے چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور پانی سے بھرے ہوئے گڑھے اور چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم ان کے لئے سونے کی جگہ کہاں بنائیں؟ بہر حال ہمیں ترکیب سوجھ گئی اور ذرا سی محنت کے بعد ہم نے ان کے لئے ایک جالی دار جھولا بنا لیا جو دو چھوٹے درختوں سے بندھا ہوا تھا۔

صدر ماؤ نے گیلے جھولے کو چھوا تو ان کی رگ مزاح پھڑک اٹھی۔ ”آج تو میں چیانگ شی کے ٹھنڈے بستر پر سوؤں گا۔!“

صدر ماؤ کی بذلہ سنجی نے ہم میں شگفتگی پیدا کر دی۔ جب ہم مشکلات میں گھرے ہوتے تو ان کے منہ سے نکلے ہوئے چند شگفتہ سے الفاظ پوری فضا کو تبدیل کر دیتے تھے۔ ان کے اس ہلکے پھلکے مذاق نے ہم میں پریشانیوں کا احساس زائل کر دیا اور ہمارے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ اب ہم ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھے۔

جب صدر ماؤ اپنے بستر میں لیٹ گئے تو ہم اپنے لئے کوئی جگہ تلاش کرنے لگے۔ بارش اب بھی جاری تھی۔ میں اندھیرے میں اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا تھا کہ اچانک میرا ہاتھ ایک چٹان سے ٹکرایا۔ جب میں اسے اپنے ہاتھ سے ٹٹول رہا تھا تو مجھے وہاں ایک سوراخ مل گیا، غار! میں بڑا خوش تھا اور بغیر سوچے سمجھے اس کے اندر گھس گیا۔ ٹھک! میرا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ یہ کوئی غار نہیں تھا بلکہ محض ایک بڑا سا سوراخ تھا لیکن یہ بھی غنیمت تھا۔ میں چوٹ کی تکلیف کو بھول گیا اور فوراً وہاں پہلو کے بل لیٹ گیا، اس طرح کہ میرا سر سوراخ کے اندر تھا۔ لیکن یہاں زمین پر اتنا زیادہ پانی کیوں ہے؟ میں نے اپنے ہاتھ سے اِدھر اُدھر ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ میں پانی کے ایک چھوٹے سے گڑھے کے کنارے لیٹا ہوا ہوں۔ اوہ، اس سے کیا فرق پڑتا ہے! میں نے اپنے سامان کی چھوٹی سی گٹھری کو گڑھے کے کنارے رکھ دیا اور اپنے جسم کو صدر ماؤ کی ٹوٹی ہوئی چھتری سے ڈھک لیا۔ میرا سر اب بھی بارش میں بھیگ رہا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو سورج طلوع ہو چکا تھا اور گھنے درختوں پر روشنی بکھیر رہا تھا۔ پھر بھی وادی میں صبح کی دھند اب تک چھائی ہوئی تھی۔ بارش ختم ہو چکی تھی اور درختوں سے موٹے موٹے قطرے

"پہاڑ کا دیوتا تمہیں گلا گھونٹ کر مار دے گا"

نیچے ٹپک رہے تھے۔ آنکھ کھولتے ہی مجھے اپنی گردن میں درد کی رو دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ عجیب قسم کا درد تھا اور اسی وقت محسوس ہوتا تھا، جب میں نیچے کی طرف دیکھتا تھا۔ میرا چہرہ پانی میں بھیگا ہوا تھا اور درد سے بچنے کی صرف یہی صورت تھی کہ میں پانی کے قطروں کو اپنے نتھنوں کے اوپر سے خود بخود بہہ جانے دوں۔ میں نے اس تکلیف کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ میرے خیال میں یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی، جس پر طوفان کھڑا کیا جاتا۔ اس لئے میں نے کسی سے ذکر، نہیں کیا۔

ہم نے ایک بار پھر اپنا سفر شروع کر دیا۔

صدر ماؤ کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ سب سے پہلے انہی کو اس بات کا احساس ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ چنانچہ انہوں نے مزاحیہ انداز میں مجھ سے پوچھا۔

"چھن چھانگ فنگ، کیا معاملہ ہے تم ہر وقت آسمان کی طرف کیوں تکتے رہتے ہو۔ کیا تم طیاروں کو تلاش کر رہے ہو؟"

میں نے اوپر درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "یہاں ہمارے سروں پر دو آسمان موجود ہیں۔ دشمن کے طیارے ہمیں تلاش نہیں کر سکتے۔ خواہ وہ کتنے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں۔"

"پھر آسمان میں ایسی کون سی چیز ہے جس میں تم اس قدر دلچسپی لے رہے ہو۔" انہوں نے ایک اور سوال کر دیا۔

میں ان کے پاس پہنچا "میری گردن میں کچھ ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نیچے کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔ جب میں اپنے سر کو حرکت دینے کی کوشش کرتا ہوں تو اس میں شدید قسم کا درد ہونے لگتا ہے۔"

صدر ماؤ ٹھٹھک کر رک گئے۔ "یہ بہت معمولی سی بات ہے۔" میں نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا، "تھوڑی دیر بعد ختم ہو جائے گا۔" میں ان کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

انہوں نے میرے آخری جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے میری گردن کو چھوا اور پیچھے مڑ کر طبی اردلی چھونگ فو چھانگ کو آواز دی کہ فوراً آ کر میرا علاج کرے۔

اب ہر شخص کو علم ہو چکا تھا۔ میرے چاروں طرف بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ شینگ شین چی اور قلی چھونگ یونگ ہونے خاص طور پر بڑی دلچسپی لی۔ انہوں نے میری گردن کو اس قدر دبایا اور مروڑا اور میری ایسی گت بنائی کہ میرے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔

چھونگ فو چھانگ نے بڑی احتیاط کے ساتھ میری گردن کا معائنہ کیا۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے صدر ماؤ کی طرف مڑا۔ "میں اس مریض کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔" اس نے کہا۔ "شاید رات کو اس کی گردن کے پٹھے اکڑ گئے ہیں۔"

صدر ماؤ کے چہرے پر قدرے سکون کے آثار نمودار ہوئے۔ "پھر بھی ہمیں اس کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔" "شینگ شین چی میڈیکل کور کے پاس جا کر ڈاکٹر کو بلا لاؤ کہ وہ آ کر چھن چھانگ فنگ کا معائنہ کرے۔"

اس سے پہلے کہ میں کہتا یہ ضروری نہیں ہے اشینگ شین چی وہاں سے جا چکا تھا۔

اس ڈر سے کہ چونکہ چلتے وقت میرا چہرہ اوپر کی طرف ہوتا ہے، اس لئے میں کہیں گر پڑوں گا۔ صدر ماؤ مجھے بازو سے پکڑے ہوئے چل رہے تھے۔ اس شفیق باپ کی طرح جو اپنے بچے کو چلنا سکھا رہا ہو۔

"گھبراؤ نہیں۔" انہوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

اتنے میں ڈاکٹر وہاں آ پہنچا۔ اس نے مجھ سے تفصیل کے ساتھ بہت سے سوالات پوچھے، میری گردن کا معائنہ کیا اور اس پر کوئی مرہم لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد درد کچھ کم ہو گیا۔

صدر ماؤ نے جب یہ دیکھا کہ اب میں اپنے سر کو حرکت دے سکتا ہوں تو انہوں نے پوچھا "اب تو تم ٹھیک ہو گئے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہیں بتایا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، اس پر انہوں نے کہا۔ "تم عجیب شخص ہو، سونے کی خاطر اپنے سر کی قربانی دینے پر تیار تھے!"

جنگلوں اور پہاڑوں کو پیچھے چھوڑنے کے بعد ہم ماؤ اڑ کھائی پہنچ گئے۔ یہاں ہم نے کچھ عرصہ قیام کیا۔ تاکہ چھانگ ہائے سیکانگ کی سرحد پر واقع گھاس کے میدان کو پار کرنے کی تیاریاں مکمل کریں۔

(باقی آئندہ)

افسانہ

نغمۂ انقلاب

تحریر: یحییٰ یکہلیف —— ترجمہ: عبدالمبین خان

خالد نے اپنی سب سے قیمتی چیز، اپنی زندگی فلسطین کی آزادی پر نثار کردی

تارے لمحہ بہ لمحہ آسمانوں کی وسعتوں میں غائب ہوتے جا رہے تھے اور ان کی جگمگاہٹ دھندلی پڑنے لگی تھی۔ میں نے لیفٹیننٹ سے کہا۔

"ہمیں اپنے ساتھیوں کے لیے کسی جگہ کو تلاش کرنا پڑے گا تاکہ تھوڑا بہت آرام کیا جا سکے —— صبح ہونے کے قریب ہے —— !"

لیفٹیننٹ خاموش رہا لیکن خالد نے پیچھے سے کہا

"حوصلے بلند رکھو اور ثابت قدم رہو —— !"

حالانکہ وہ بہت تھکے ہوئے تھے لیکن ہمارے ساتھی سخت اور نوکیلی چٹانوں پر جوانمردی کے ساتھ قدم اٹھائے مارچ کر رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد لیفٹیننٹ اپنی مشین گن کو بائیں ہاتھ سے لے کر دائیں ہاتھ میں تھام لیتا اور پھر بائیں ہاتھ میں لے لیتا اور کندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے کو دوبارہ ٹھیک کرنے لگتا۔

میں نے سر گھما کر پیچھے دیکھا خالد اپنے انتہائی جذبے کی حرارتوں کو سمیٹے چل رہا تھا اور اس کے پیچھے چلنے والے دوسرے لوگوں کے چہرے بھی اسی حرارت سے تمتما رہے تھے۔ وہ مجھ سے بمشکل پانچ میٹر کے فاصلے پر ہوگا۔ میری نظریں اس کی سخت آنکھوں سے ٹکرائیں۔ وہ مسکرا دیا۔ اور مجھے آگے کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا کہ کہیں میں کسی چٹان سے الجھ کر نہ گر پڑوں۔

کچھ فاصلے پر ایک غار سا دکھائی دیا جو خودرو خاردار جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ لیفٹیننٹ نے کہا —— "ہم دن اس غار میں گزاریں گے !"

ہمارے ساتھی ایک ایک کر کے غار میں آرام کے لیے داخل ہو گئے۔ خالد جو لیفٹیننٹ کے برابر میں کھڑا تھا، آخری آدمی تھا جو غار میں داخل ہوا۔

غار کے اندر خالد مجھ سے زیادہ دور نہیں بیٹھا تھا اس نے جیب سے سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر کش لینے لگا جبکہ دوسرے کھانے میں مصروف تھے۔ میں نے اپنا تھیلا کھولا، کچھ کھانا اور نکالا اور روٹی خالد کی طرف بڑھائی اس نے مسکراتے ہوئے اپنی انگلیوں کے بیچ میں تھامی ہوئی سگریٹ کی طرف اشارہ کیا اور شکریہ ادا کیا۔

مجھے یاد آیا کہ ہم نے آخری بار ایک ساتھ کھانا اپنے فوجی اڈے پر کھایا تھا۔ چودہ گھنٹے پہلے وہاں سے روانگی میں کچھ دیر باقی تھی۔ میں اس کے پاس کھانا لے کر گیا تھا اس وقت وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح وہ بہت ہی دلنشیں دھن میں سیٹی بجا رہا تھا۔ اسے سیٹی بجانے کی عادت تھی۔ حقیقت میں اسے سیٹی بجانے سے روکنا —— خواہ کتنے ہی دشوار اور خطرناک لمحے کیوں نہ ہوں، بہت مشکل تھا۔ ہمارے ساتھی اکثر اس عادت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے۔

خالد، ہمارے انقلاب کے ایک گانے کے لیے ایک بہترین دھن تیار کرنے کی کوشش کر رہا ہے !"

میں نے خالد سے پوچھا :-

"تم کیا لکھ رہے ہو —— ؟"

"نہیں —— میں زبانی وصیت کا قائل ہوں"

وہ لکھنے میں مصروف رہا جبکہ میں اس انتظار میں کھڑا تھا کہ ہم دونوں مل کر کھانا کھائیں گے۔ وقت کسی چشمے کی طرح دھیمے دھیمے گزر رہا تھا۔ میں نے نسبتاً اونچی آواز میں پوچھا —— بتاتے کیوں نہیں —— تم کیا لکھ رہے ہو —— ؟ کیا کوئی خط ہے جو تم اپنی منگیتر کو لکھ رہے ہو —— ؟"

مسکراہٹ ہولے سے اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اور وہ بولا —— "اس کے لیے وقت نہیں ہے۔"

میں جھلا سا گیا اور پھر ہلاتے ہوئے بولا —— "پھر یہ کیا ہے —— ؟"

"میں اپنا امتحان لے رہا ہوں —— !" اس نے ٹھہرے ہوئے اور پُرسکون لہجہ میں کہا

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو !"

میں بولا۔

اس نے لکھنا چھوڑ دیا اور بولا —— "میں اپنے اوپر تنقید کر رہا ہوں۔ مجھ سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی تھیں جس وقت کہ میں بعض مہمات میں حصہ لے رہا تھا" خالد چند لمحے خاموش رہا پھر اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"غشمیر کی مہم کے دوران مجھ سے کچھ ہتھیار کھو گئے تھے۔ ال۔ لائڈ روڈ (AL-LID ROAD) کی مہم کے دوران میں نے وقت سے پہلے ہی ایک بارودی سرنگ کو اڑا دیا تھا۔ یہ تمام غلطیاں ایسی ہیں جنہیں ایک سے زائد بار دہرانا نہیں چاہیئے۔"

اچانک لیفٹیننٹ نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"سگریٹ کم پیو اور بہت ہی دھیمی آواز میں بات کرو —— !"

خالد نے سگریٹ بجھا دیا —— سب لوگ سونے کے لیے غار کی تنگ جگہ میں آڑے ترچھے لیٹ گئے۔ لیفٹیننٹ بھی آرام کرنے کے لیے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس نے کچھ کھایا نہیں تھا۔ جب میں نے اپنی آنکھیں بند کیں۔ خالد غار سے باہر کھڑا ماحول کی نگرانی کر رہا تھا۔

خالد نے میری ٹانگ ہلاتے ہوئے مجھے جگایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے تھرماس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا —— "منہ دھو لو اور کچھ پانی پی لو، ہم اب روانہ

ہونے والے ہیں۔ آزمائش کے لئے بہت قریب ہیں۔"

جب ہم روانہ ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے خالد کی مخصوص سیٹی کی آواز ہوا میں رقص کر رہی تھی۔ لیفٹیننٹ نے ہم سے ایک بار پھر پلان کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا اور مشن کی خاص خاص باتوں کی دونوں گروپوں کے سامنے دوبارہ وضاحت کی۔ ان میں سے ایک گروپ وہ تھا جس کو آگے بڑھ کر حملہ کرنا تھا اور دوسرا وہ تھا جسے پہلے گروپ کی ہنگامی صورت میں مدد کا کام سونپا گیا تھا ——!

اندھیرے کا سیاہ غلاف ماحول میں پھیلا ہوا تھا۔ لیفٹیننٹ نے گھڑی دیکھی اور بتایا کہ تین گھنٹے پیدل اور چلنا ہوگا۔ ہم غار میں سے نکلے اور مارچ شروع کر دیا۔ تاریکی کا گاڑھا گاڑھا لاوا ہر سُو اُبل رہا تھا اور اس لاوے نے ہر چیز کو چھپا لیا تھا۔ ہم اپنی انگلیوں کو اپنی آنکھوں کے قریب لا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لیکن ہم ایک قطار میں آگے بڑھتے رہے۔ اَن دیکھی روشنیاں ہماری رہنمائی کر رہی تھیں۔ ہر ایک اپنی چھوٹی مشین گن کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا اور کارتوسوں اور دستی بموں کا تھیلا کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ ہم ناہموار پہاڑ پر محتاط قدم اٹھاتے سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ ذرا سا پاؤں پھسلنے سے ہم میں سے کوئی بھی گہری کھائیوں میں گر سکتا تھا۔ جہاں موت کی دیویاں خوفناک قہقہوں کے ساتھ اس کو اُچک لیتیں۔

اچانک میں نے اپنی پشت سے ایک آواز سنی۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی کچھ پتھروں کے لڑھکنے کی آوازیں خاموشیوں کو زخمی کرنے لگیں۔ ہم سب دفعتاً رک گئے لیفٹیننٹ نے پوچھا:۔

"کیا ہوا —— ؟"

ہم نے خالد کی آواز سنی جو اندھیرے میں کہیں سے آ رہی تھی۔ ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گڑھے میں گر پڑا تھا۔

"کوئی چوٹ تو نہیں آئی —— ؟" لیفٹیننٹ کے لہجے میں فکر اور بے تابی کا انداز پنہاں تھا۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور اس اندھیرے میں خالد کی آواز تیزی ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔

"نہیں —— میں بالکل ٹھیک ہوں ——!"

ہم نے دوبارہ اپنا مارچ شروع کر دیا۔ فضا کی خاموشی نے ہمارے لبوں پر بھی گہرا سکوت ثبت کر دیا تھا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ اور میں نے پیچھے سر گھما کر کہا —— "خالد! کیا واقعی تمہیں کوئی چوٹ نہیں آئی —— ؟"

"میری پتلون پھٹ گئی ہے۔ اور کندھوں پر معمولی خراشیں محسوس ہو رہی ہیں" خالد نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

سرگوشی کی آواز سن کر لیفٹیننٹ سخت لہجے میں بولا —— "باتیں نہیں کرو ——!" ہم دوبارہ خاموش ہو گئے۔ لیکن میں اپنی آنکھوں کے سامنے خالد کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ جس میں وہ ہونٹوں کو سکیڑے اپنے مخصوص انداز میں سیٹی بجا رہا تھا۔

آخرکار ہم پہاڑ کی بلندی پر پہنچ گئے اور اب ہم کو پہاڑ کی دوسری جانب نیچے اترنا تھا۔ دور فاصلے پر اسرائیلی کیمپ کی روشنیاں چمکتی نظر آ رہی تھیں۔ لیفٹیننٹ ہمارے قریب آیا اور بولا —— "تیار ہو جاؤ!"

جلدی جلدی سب لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ جیسا کہ پہلے طے کیا جا چکا تھا۔ میں نے اپنا تھیلا نیچے ایک ابھری ہوئی چٹان پر رکھا اور بارودی سرنگ نکال کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس مہم میں میری ذمہ داری یہ تھی کہ میں اسرائیلی کیمپ کی طرف جانے والی سڑک پر بارودی سرنگ بچھا دوں۔ خالد کو میری حفاظت کرنا تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے مشن پہ روانہ ہوتا۔ خالد نے میرے ہاتھ تھام لیے اور کہا —— "اللہ تمہارا محافظ و نگہبان ہو!"

میں مسکرایا اور پھر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ جب میں اپنے مشن سے واپس آ رہا تھا تو حملہ آور گروپ کے ٹینک شکن یونٹ نے اسرائیلی کیمپ پر حملہ شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی فضا میں چنگاریاں اڑنے لگیں اور فائرنگ کی آواز سے زلزلہ سا آ گیا۔

میری پوزیشن دشمن کی نظر میں تھی اور اسی وجہ سے جھاڑیوں سے گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ خالد آئے گا اور دشمن کو خاموش کر دے گا لیکن مجھے مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ میرے چاروں طرف گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں۔

بالآخر میں نے دستی بم سے دشمن پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور چند ہی لمحوں بعد بم کا دھماکہ فضا کو لرزا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دشمن کی طرف سے فائرنگ رک گئی۔ میں بھاگتا ہوا اس جگہ آیا جہاں خالد بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا —— "تمہیں کیا ہو گیا؟"

خالد نے سر اٹھایا اور دردآمیز آواز میں بولا "میری انگلیاں سوجھ گئی ہیں۔ میں انہیں بڑی مشکل سے ہلا پاتا ہوں —— مشین گن کا بٹن دبانا میرے لیے ناممکن ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ پہاڑ پر چڑھتے ہوئے وہ ایک گڑھے میں گر پڑا تھا اور اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے تھے میں بالکل خاموش رہا۔

حملہ آور گروپ اب تک اپنی کارروائیوں میں مصروف تھا۔ میرے برابر میں خالد بیٹھا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر غصے اور ملامت کی پرچھائیاں تھیں۔ اچانک اس نے زمین پر گھونسہ مارا اور غصے سے بولا ——

"یہ سب کچھ اس آزمائش کے وقت کیوں ہوا؟ —— کیوں —— ؟"

اسی اثنا میں دو فوجی ٹرک دور سے آتے دکھائی دیئے۔ جب اُن میں سے پہلا ٹرک بارودی سرنگ پر سے گزرا جو میں نے بچھائی تھی تو ایک ہیبت ناک دھماکے سے زمین لرز اٹھی اور بارود کی روشنی میں ٹرک کے ٹکڑے فضا میں دور تک اڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ لیکن دوسرا ٹرک یکدم دوسری طرف مڑ گیا۔ خالد کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ اس نے دستی بموں کی بیلٹ کو ٹٹولا جو اس کے سینے پر بندھی ہوئی تھی اور پھر مشین گن میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا —— "یہ میری گن ہے —— جب تم واپس جاؤ تو اسے مرکز کو لوٹا دینا ——!"

اور پھر وہ واپس جاتے ہوئے ٹرک کی جانب دوڑا —— میری ششدر آنکھوں نے دیکھا کہ اس نے ٹرک پر چھلانگ لگائی اور پھر ایک خوفناک دھماکے کے بعد ٹرک ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دور تک بکھر گیا۔ اور شعلے ہر طرف بھڑکنے لگے۔

خالد نے اپنی سب سے قیمتی چیز —— اپنی زندگی فلسطین کے عوام کی آزادی پر نثار کر دی۔ اپنے مشن کے بعد جب ہم واپس آ رہے تھے تو ہم میں سے ہر ایک خاموش تھا۔ خالد کی مشین گن میرے کندھے پر لٹک رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہماری روحوں کو گدگدانے لگی۔ اور جب یہ جھونکا خالد کی مشین گن پر سے گزرا تو ایک سیٹی کی آواز فضا میں بکھرنے لگی۔ مجھے یوں لگا کہ خالد اب بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ زندہ ہے اور میں اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں کو سکیڑے ہوئے تھا اور مخصوص دھیمی سُر میں سیٹی بجا رہا تھا۔



سندھ متحدہ محاذ کے صدر جناب جی۔ایم۔سید ۱۴ مئی ۱۹۷۲ء کو میرپور بھورو کے جشنِ لطیف میں جو صدارتی تقریر کی اس کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ تقریر جی ایم سید کی "سندھو دیش" کی تحریک سے پردہ اٹھاتی ہے (ادارہ)

"جیئے سندھو دیش" کہنے والا دوست اور چڑنے والا دشمن"

محبانِ لطیف —— !

لطیف سندھو دیش کی پانچ ہزار سالہ تاریخی ثقافت کے علمبردار ہیں۔ لطیف سندھ کے روحِ رواں ہیں۔ سندھ، لطیف کے سوا بے جان ہے۔ اگر آپ محبِ سندھ بننا چاہتے ہیں تو لطیف کے پیغام کا جاننا ضروری ہے۔ اس کا پتہ ان باتوں سے لگے گا کہ

(۱) آپ سندھو دیش سے محبت رکھیں

(۲) آپ سندھی قومیت کے نشہ میں سرشار ہوں

(۳) آپ کو سندھی زبان سے پیار ہو

مذکورہ باتیں اپنائے بغیر آپ دربارِ لطیف میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ اس محبت کی کسوٹی یہ ہوگی کہ آپ صدقِ دل سے یہ عہد کریں کہ:

(۱) سندھو دیش کو غیروں کے سیاسی تسلط، اقتصادی استحصال اور ثقافتی غلبہ سے بچانے کے لیے جدوجہد کریں گے۔

(۲) سندھیوں کی قومی یکجہتی اور فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہیں گے۔

(۳) سندھی زبان کے فروغ اور ترقی کے لیے حسبِ ذیل اقدامات کریں گے۔

(ل) سندھو دیش کی واحد قومی اور سرکاری زبان سندھی کو تسلیم کرائیں گے۔

(ب) سندھ میں رہنے والے ہر ایک شخص کے لیے سندھی زبان کا سیکھنا لازمی قرار دیں گے۔

(ت) سندھ میں تجارتی فرموں، کارخانوں اور سرکاری نیم سرکاری ملازمتوں کے لیے سندھی زبان سے واقفیت لازمی قرار دیں گے۔

(ث) پاکستان کی قومی زبان اردو کے بجائے سندھی بنائیں گے۔

(ج) سندھ میں ریڈیو اور ٹیلیویژن اسٹیشنوں سے نوے فیصدی وقت سندھی پروگراموں کے لیے مقرر کریں گے۔

(چ) سندھ کے سینماؤں میں ۸۰ فیصد اردو فلمیں دکھانے پر پابندی لگائیں گے۔

دوستو! آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیاوی کاروبار میں دو قوتیں اثر انداز ہوتی ہیں جنہیں خیر اور شر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ "خیر" کی قوت مددگار، دوست اور فائدہ مند ہوتی ہے اور "شر" کی قوت مخالف، دشمن اور نقصان دہ ہوتی ہے۔ اگرچہ ان قوتوں کا دنیا کی ہر بات میں دخل ہے لیکن ان میں تمیز کرنا بہت مشکل ہے —— !

تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ سندھ کی سیاست، اقتصادیات اور ثقافت پر بھی یہی قوتیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ سندھ کے دوست اور دشمنوں کو اگر پرکھنا ہے تو انہیں حسبِ ذیل کسوٹی پر آزمایا جاسکتا ہے۔

(۱) جو شخص "جیئے سندھو دیش" (سندھو زندہ باد) کے نعرے پر خوش ہوتا ہے وہ دوست ہے اور جسے اس نعرے سے چڑ لگتی ہے یا شرم آتی ہے وہ دشمن ہے —— !

(۲) جو شخص "جیئے سندھی قوم" (سندھی قوم زندہ باد) پر خوش ہو وہ دوست ہے جو اس نعرے کی مخالفت کرے یا اس پر غصہ کرے اسے دشمن سمجھنا چاہیئے۔

(۳) جس شخص کو سندھی واحد سرکاری اور قومی زبان بنانے پر خوشی ہو وہ دوست ہے۔ جو شخص سندھی پر اردو کو ترجیح دے وہ دشمن ہے۔ بدقسمتی سے سندھیوں میں دوست کی تمیز کم ہونے کی وجہ سے ان کے مخالفوں اور بیرونی ایجنٹوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ مثلاً ——

(۱) سندھ کے کتنے ہی سیانے افراد مخالف طاقتوں سے مرعوب ہو کر ایسی محفلوں میں ۹۵ فیصد افراد سندھی جاننے والے ہوتے ہیں اور صرف ۵ فیصد اردو داں حضرات ہوتے ہیں۔ ان کی خوشامد کے لیے یہ کہ کر اردو میں تقریر کرتے ہیں کہ وہ اپنا مافی الضمیر سندھی میں اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے۔

(۲) کتنے ہی معتبر افراد ایسے ہیں کہ ان کی محفلوں میں کچھ افراد کے زندہ باد کے نعرے لگتے ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اگر وہاں "جیئے سندھ" کا نعرہ بلند کیا جائے تو غصہ سے ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے جیسے شاید کسی نے انہیں گالی دے دی ہو۔ اس رویے سے حوصلے بلند کرتے ہوئے ایک عالم کو یہ کہنے کی بھی جرأت ہو گئی کہ "جیئے سندھ" کے معنی "مرے پاکستان" ہے !

(۳) حیدرآباد اور کراچی میں مقیم کتنے ہی سندھ کے مخالف افراد نے سندھ کے دوستوں کی طرف سے دیواروں پر "جیئے سندھ" کے لکھے ہوئے نعرے کو کاٹ کر

شاہ لطیف کے ہیرو اور ہیروئن سندھی اور غیر مسلم تھے

اس کی جگہ "صرف کہو جئے پاکستان" ، لکھ دیا ہے۔ سندھی نسل کے کئی لوگ ایسے بھی ہیں جو اس صورت حال پر رنجیدہ ہونے کے بجائے خوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہیں مخالفوں کی طرف سے مرعوب ہونے کا شوق دامنگیر ہے۔

(۴) سندھی ثقافت کو مٹانے کے لیے باہر کے لوگوں نے اپنے دورِ تسلّط میں سندھ کے ریلوے اسٹیشنوں کے سائن بورڈ ، راستوں وغیرہ کے نام وغیرہ اردو میں لکھ دیئے ہیں جو مضحکہ خیز ہو گئے ہیں اور راستوں کے پرانے نام مٹا کر باہر کے نام لکھ دیئے ہیں، سندھ کے کچھ ایسے صاحبان بھی ہیں جو برسرِ اقتدار آنے کے بعد بھی اپنے آقاؤں کو رضامند کرنے کے لیے ان کے ظلم کا سدِّباب نہیں کرتے۔

(۵) سندھ کی پانچ ہزار سالہ تاریخ زبان، وطن، ثقافت ، تاریخی روایات ، سیاسی اور اقتصادی مفاد رکھنے کے باوجود قوم کہنے پر ناراض ہوتے ہیں۔ لیکن ۲۵ سالہ "مہاجر، پنجابی مستقل مفاد" کی ایجاد کردہ مسلم قوم کے نام پر سندھی قوم کو ختم کرنے کی سازش میں شریک ہونے کو عیب نہیں سمجھتے۔

(۶) سندھ کی ثقافت ، سیاست اور اقتصادی مفاد کی حفاظت کے لیے آواز اٹھانے والوں کو علاقائی تعصب رکھنے والے بھارتی ایجنٹ کہہ کر انہیں کچلنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ ان باتوں پر غور کرنے کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سندھ اور لطیف کا مخالف کون اور دوست کون ہے۔

صرف لطیف کے میلے پر حاضری دینا ہی کافی نہیں بلکہ لطیف کے پیارے سندھ کی مذکور باتوں سے محبت رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس وقت سندھ دوراہے پر کھڑا ہے ایک راستہ تنزلی کی طرف جاتا ہے اور دوسرا ترقی کی جانب! یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کونسا راستہ اختیار کرتے ہیں ——!

آخر میں مَیں آپ کو شاہ صاحب کے چند "بیت" ، سنا کر ان پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

دیسي سیٹ کھن پر دیسي کھڑا پيرين

یہاں پردیسی وہ شمار کیے جائیں جنہوں نے ۲۵ سال گزرنے کے باوجود سندھی زبان نہیں سیکھی۔ شاہ صاحب نے سندھ کو دیس کہا ہے اور اس میں رہنے والوں سے محبت کرنے کی تلقین کی ہے۔ ؎

ذریان مئي ذاریان، جنت مئي ءَ جانہ ٿيا!

یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو سندھ میں رہنے کے باوجود سندھیوں کی زبان اور ثقافت اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ انہیں لڑانے کی کوشش کر رہے ہیں ——!

؎ حيف تنين کي هوءِ ، وطن جن وساريو!

یہاں وطن فراموش کرنے والے وہ شمار کیے جائیں گے جو غیروں کے افکار وطن کے ایجاد کردہ نظریے سے گمراہ ہو کر ہزاروں سال سندھو دیش کو کھو رہے ہیں

؎ اي نہ مارن ريت، جيئن سِٹ مٹائين سون تي!

یہاں شاہ صاحب ان لوگوں سے مخاطب ہیں۔ جو غیروں کے اقتدار اور عزت پر سندھ اور سندھیوں کو فراموش کرنے کے لیے تیار ہیں۔

قسمت قيد کياس، نہ تہ کيئن اچي هن کوٹ ۾؟

اس مصرعہ میں شاہ صاحب نے سندھیوں کو غیروں کی سیاسی غلامی، اقتصادی استحصال اور ثقافتی غلبے کے تحت آنے کا احساس دلایا ہے۔

؎ جيها جي تيها، هوت مارو ڄيا!

اس مصرعہ میں شاہ صاحب نے سندھیوں کی کسمپرسی اور دوسری برائیوں کے باوجود غیر مشروط طور پر محبت کا اظہار کیا ہے۔

منهن جي آس اها کڏهن کيئي ٿيندي ڪوٽ کي؟

اس مصرعہ میں شاہ صاحب نے سندھیوں کو سیاسی غلامی، اقتصادی استحصال اور ثقافتی غلبے سے آزاد ہونے کی دعا مانگی ہے۔

شاہ لطیف سندھی تھے۔ ان کے ہیرو اور ہیروئنیں بھی سندھی تھیں۔ مومل رانو، عمر ماروی ، لیلاں چنیسر، سسئی پنوں سب سندھی اور غیر مسلم تھے۔ انہوں نے کبھی بھی مسلم قوم کا نام نہیں لیا۔

دوستو! نعرہ تو لگاؤ جئے لطیف، جئے ان کا سندھ ، جئیں ان کے مارو (عوام) اور ان کی شیریں سندھی زبان ، جئے سندھ!

سرمایہ دار پیداوار میں کمی کر رہے ہیں: صفحہ ۴۱ سے آگے

کی تعداد گھٹا کر نو گانٹھیں کر دی گئی ہیں۔ آپ بتائیں کیا مزدور پروڈکشن بڑھانے کے لیے اپنے گھر سے روئی کی گانٹھیں لائیں گے۔ اسی طرح بے شمار ملوں میں جہاں کئی کئی شفٹیں چلتی تھیں۔ ان میں دو ایک شفٹیں چلائی جا رہی ہیں۔ اس کی آڑ میں سینکڑوں مزدور بے روزگار کر دیئے گئے۔ پروڈکشن میں جان بوجھ کر کمی کر دی گئی اور حکومت کو یہ یقین دلایا جا رہا تھا کہ پروڈکشن میں کمی کے ذمہ دار مزدور ہیں۔ جب تک ان پر لاٹھی گولی کا استعمال نہیں کیا جائے گا یہ سیدھے نہیں ہوں گے۔

باور خان نے کہا کہ مزدوروں نے جلاؤ نہیں کیا، الزام لگانے والے اس قسم کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں کر سکتے۔ البتہ مزدوروں نے جہاں جہاں گھیراؤ کیا پیداوار میں اضافہ کیا، مزدوروں کو بدنام کرنے کے لیے حکومت اور سرمایہ دار اس بات کو ہوا دے رہے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ ملک کے حالات کے پیشِ نظر اور بعض عناصر کی سازشوں کی وجہ سے مزدوروں نے ہڑتال ختم کر دی۔ دس روزہ ہڑتال کے بارے میں کہا کہ یہ ہڑتال مزدور تحریک کی تاریخ میں ایک زبردست کامیابی ہے۔

باور خان نے آخری سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہماری لڑائی معاشی مراعات کی لڑائی نہیں ہے خالص طبقاتی جدوجہد ہے جو بتدریج مزدوروں کی قیادت میں انقلابی رنگ اختیار کر لی جائے گی۔ مزدور موجودہ استحصالی نظام ختم کرنے کے لیے متحد ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ جب تک سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ نظام باقی رہے گا لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ مزدور اس نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر ہی دم لیں گے چاہے انہیں آگ کے سمندر میں سے گزرنا پڑے وہ گزریں گے —— گزریں گے ——!



پیپلز پارٹی کی تنظیم ۔ عوام اور کارکن کیا کہتے ہیں

آج بھی سفارش اور رشوت کا سہارا لینا پڑتا ہے

عزیز خان مغل، رکن مجلس عاملہ پیپلز پارٹی، یونٹ لطیف آباد، حیدر آباد

(۱) پیپلز پارٹی کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے اس کی مقبولیت کم ہو گئی۔ کیونکہ محنت کش عوام نے اسلامی سوشلزم، روٹی، کپڑا، مکان کی ضمانت پر پیپلز پارٹی کو ووٹ دیئے تھے۔ لیکن وہ لوگ ان چیزوں سے محروم رہے اور آج بھی وہ ان مسائل سے دوچار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہرگز نہ سمجھی جائے کہ پارٹی عوام سے کیے ہوئے وعدوں سے منحرف ہو گئی۔ اقتدار بھٹو صاحب کے لیے کانٹوں کا بستر ثابت ہوا ——

(۲) پارٹی کے برسر اقتدار آنے پر عوام نے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں کیونکہ اصلاحات سے فوری طور پر عوام کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ ہر شخص کو حصول روزگار کے لیے آج بھی "سفارش"، اور "رشوت" کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مہنگائی سر پر قائم ہے، ملاوٹ بدستور جاری ہے۔

(۳) اقتدار پر جانے کے بعد سے وزرا اور کارکنوں کے درمیان رابطہ بالکل منقطع ہو گیا بلکہ یوں کہا جائے کہ اعلیٰ عہدوں پر جانے کے بعد سے یہ لوگ کارکن اور محنت کش عوام کے احسان بھول گئے ہیں جن کے دم سے یہ لوگ اس منزل تک پہنچے جس کی وجہ سے عوام میں بد دلی پیدا ہو گئی ہے۔

(۴) اقتدار پر جانے کے بعد رہنماؤں کا رویہ کارکنوں سے اچھا نہیں رہا اور نہ ہی ان کو پارٹی سے وابستگی کا کچھ احساس ہے۔ رابطہ منقطع ہونے کی وجہ سے کارکنوں کے پاس بے شمار عوامی مسائل الجھے پڑے ہیں۔ حیدر آباد کی مرکزی پیپلز پارٹی کے دفتر کا یہ حال ہے کہ نہ کوئی لٹریچر ہے اور نہ ہی کوئی اخبار آتا ہے۔ یہاں تک کہ بنیادی ضرورت ٹیلیفون سے بھی محروم ہے اور قومی رہنما اس طرف توجہ بھی نہیں فرماتے۔

(۵) تنظیم و اتحاد کے لیے سب سے پہلے خود غرض اور مفاد پرست عناصر کی رکنیت کو کالعدم قرار دے دیا جائے۔ یہ لوگ پارٹی کو بدنام کرتے رہے ہیں۔ سرکاری نمائندوں اور کارکنوں کے درمیان رابطہ قائم رکھنے اور مسائل کے سلجھاؤ کے لیے ایک رابطہ کمیٹی بنائی جائے۔ جس کا ایک مقررہ اجلاس ہوا کرے۔ اس سے پارٹی میں تنظیم رہے گی۔ اور کارکنوں کو بھی مشکلات پیش نہیں آئیں گی۔

معمولی باتوں کی وجہ سے آپس میں گروہ بندیاں نہ کی جائیں اور نہ اختلاف کو ہوا دی جائے۔ بلکہ ان مسئلوں کو صبر و تحمل سے حل کر لیا جائے۔

کارکن، مزدوروں، کسانوں طلبا کی تنظیموں سے رابطہ قائم رکھیں اور غریب لوگوں کو پارٹی میں شامل کیا جائے۔

سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی ممبرشپ پر پابندی عائد کر دی جائے اور ان کو قطعی پارٹی میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔

پارٹی کی نچلی سطح کے الیکشن منعقد کرائے جائیں تاکہ نئے لوگوں کو خدمت کا موقع ملے اور اجارہ داری ختم ہو۔

(۶) کمائی تو نہیں کی گئی لیکن کمائی کا انوکھا ڈھنگ اختیار کیا گیا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ جناب وزیر اعلیٰ ممتاز بھٹو کے ایک رشتے کے بھائی جناب معشوق علی بھٹو جو حیدر آباد کے ایک ٹیکسٹائل مل کے مالک جناب نور الٰہی کی زمین پر نجی ملازم ہیں۔ جناب معشوق علی بھٹو کا سیاہ کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس مل کی یونین جو کاف کاٹ ٹیکسٹائل پیپلز یونین کہلاتی تھی اور سوشل سامراج کے خلاف مزدوروں کی نمائندگی کرتی تھی۔ اس یونین کے خلاف کاف کاٹ مل کے مالک کی بھرپور حمایت اور مدد کی۔ یہاں تک کہ جناب میر رسول بخش سابق سینئر منسٹر اور موجودہ گورنر سندھ اور حیدر آباد کی پوری انتظامیہ کو اپنے اثر و رسوخ سے مفلوج کر دیا۔ میں نے اور حیدر آباد کے ایک ہفت روزہ سندھی اخبار "ہدایت" کے ایڈیٹر جناب ٹکانو کامریڈ سیال نے انتہائی بردباری سے کام لیتے ہوئے مصالحت چاہی لیکن معشوق علی بھٹو کے لیے سیٹھ کی تجوری کھلی ہوئی تھی۔ بالآخر جناب بھٹو نے حیدر آباد کے ڈپٹی کمشنر کو مفلوج کر کے مزدوروں کو اس حد تک مجبور کر دیا کہ تقریباً ۴/۱ ۵ سو مزدوروں نے اپنے استعفے زبردستی علاقائی مجسٹریٹ جناب بلوچ صاحب اور جنرل مینیجر کاف کاٹ کو پیش کر دیا۔ ان کا ریکارڈ اب تک مل میں موجود ہے اور مزدور اب کسمپرسی کے عالم میں بے روزگار پھر رہے ہیں۔

(۷) میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے

(۸) یہ تاثر بالکل بے بنیاد اور غلط ہے کہ کارکن انتظامیہ کے کاموں میں مداخلت کرتے ہیں

یہ بات پارٹی کے لئے زہر قاتل ہے

افتخار احمد بٹ، سیکرٹری
مزنگ ۔ لاہور

(۱) پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آنے کا پہلا تاثر "خوشگوار" ہے۔ پارٹی

کافی حد تک یہ توقعات پوری ہونے کی امید ہے۔

(۲) عوام نے پارٹی سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ کیونکہ عوام کو حسین خوابوں اور خوشگوار تعبیروں کا مژدہ سنایا گیا تھا جو ہر سیاسی پارٹی الیکشن لڑنے کے لیے کیا کرتی ہے۔ جہاں تک ان توقعات کے پورا ہونے کا تعلق ہے۔ پارٹی نے منشور کے مطابق کام کیا ہے۔ مزید کام ہو رہا ہے۔ مختلف قسم کی اصلاحات نافذ کی گئی کی گئی ہیں۔ ان کے قوانین بن رہے ہیں۔ اگر ان پر ایمانداری سے عملدرآمد ہؤا تو کوئی وجہ نہیں کہ عوام کی توقعات پوری نہ ہوں۔ لیکن صرف پارٹی کے ارکان کے مخلص ہونے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ عام آدمی کو بھی اپنے طور طریقے بدلنے ہوں گے۔ کردار سازی اہم چیز ہے۔ اس کی طرف توجہ دیئے بغیر کوئی پروگرام خواہ وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔

(۳) پیپلز پارٹی کی قیادت اور کارکنوں کے درمیان وہ رابطہ نہیں رہا جو الیکشن سے پہلے تھا۔ یہ قدرتی امر ہے۔ ہمارے علاقہ میں پوزیشن یہ ہے کہ قومی اسمبلی کے ممبر شیخ محمد رشید وزیر بن چکے ہیں۔ مصروف ہو چکے ہیں۔ چیدہ چیدہ اور نمایاں کارکنوں کو تو لفٹ دیتے ہیں مگر گمنام کارکنوں سے ان کا رابطہ مکمل طور پر کٹ چکا ہے۔ صوبائی اسمبلی کے رکن عبدالحفیظ کاردار صاحب مکمل طور پر کارکنوں سے کٹ چکے ہیں کوئی رابطہ نہیں رہا۔ ہم کارکن یہ سمجھ چکے ہیں کہ الیکشن سے پہلے کا معاملہ اور تھا اور اب معاملہ کچھ اور ہے۔ دراصل اب ان حضرات کو ہماری "ضرورت" نہیں رہی۔ اس قسم کی شکایت عام کارکنوں کو ہے کہ ممبرانِ اسمبلی "بدل" گئے ہیں یہ نہایت بری بات ہے اور پارٹی کے لیے زہرِ قاتل! کاش یہ ممبران حضرات پہلی سیاسی پارٹیوں کے حشر کو سامنے رکھیں۔

(۴) سرکاری عہدوں پر فائز ہونے والے رہنماؤں کا رویّہ یقینی طور پر قابلِ اعتراض ہے، وہ غلط وعدے کرتے ہیں اور کارکنوں کے کسی جائز کام یا عوام کی شکایت پر بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ چمچے قسم کے لوگوں نے ان کو گھیر رکھا ہے اور مخلص کارکن کی ان تک رسائی نہیں ہے۔

(۵) کارکنوں کی سطح تک پارٹی میں کسی حد تک اتحاد پایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں جھگڑے ہیں مگر ان کا حل ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پارٹی (ضلع یا شہر کی حد تک) کو ہر ماہ کارکنوں کو ایک جگہ جمع کرنا چاہیئے تاکہ ان کا ایک دوسرے سے رابطہ رہے مگر ایسا اس لیے نہیں ہو رہا کہ اس سے کچھ مفاد پرست رہنماؤں کو تنقید کا خوف ہے۔ لاہور شہر کی پارٹی کی ہر وقت یہ کوشش رہتی ہے کہ کارکن مِل کر نہ بیٹھیں۔ مِل بیٹھنے پر سرزنش کی جاتی ہے تنظیم کا فقدان ہے تنظیم پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی اور نہ ہی نظریاتی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ ڈر ہے کہ اگر یہی عالم رہا تو پارٹی کو سخت دھچکا لگے گا۔ رہنماؤں کو اس طرف توجہ دینی چاہیئے۔ مَیں تو بعض اوقات اس معاملے پر سوچتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔

(۶) ہمارے علاقہ میں پارٹی کے کسی بااثر فرد نے کوئی ناجائز کمائی نہیں کی۔ مخالف جماعتیں اس قسم کا پراپیگنڈا ضرور کرتی ہیں لیکن یہ الزام درست نہیں ہے

(۷) میرے خیال میں پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے۔

(۸) ہم لوگ پولیس، نوکر شاہی اور عدلیہ کے کاموں میں مداخلت کرتے ہیں۔ لیکن یہ مداخلت کچھ اس طرح کی ہے کہ ہم ان اداروں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ عوام کے خادم بن کر کام کریں، رشوت نہ لیں، سفارش قبول نہ کریں اور اپنے افسرانہ ذہن کو بدلیں۔ اگر یہ مداخلت کہلاتی ہے تو ہم مداخلت ضرور کریں گے کہ عوام کی خدمت ہمارا فرضِ اولین ہے۔

برسرِاقتدار طبقے نے پارٹی کو نوکرشاہی کی گود میں ڈالدیا

یونس محبوب چودھری جنرل سیکرٹری پیپلز پارٹی، سیالکوٹ

(۱) برسرِاقتدار آنے کے بعد بھی پارٹی کے کردار کو عوامی رہنا چاہیئے۔ پارٹی کو چند ارسٹوکریٹ اور جاگیرداروں اور صنعت کاروں کی فلاح اور مفاد کے لئے وقف نہیں ہونا چاہیئے۔ اور نہ ہی کوئی نیا مراعت یافتہ طبقہ پیدا کرنا چاہیئے۔ برسرِاقتدار آنے والے مجھے ایسا ہی کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ پارٹی کا کردار اب اسمبلیوں کے ممبران، وزیروں اور مشیروں کے ہاتھوں میں ہے۔ ۲۰ر دسمبر سے قبل یہ کام ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ اور ہم عوامی کردار ادا کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ لیکن اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اب کام کرسی والوں کا ہے۔ کیونکہ اب وہ جو کریں گے۔ وہی پارٹی کردار تصور ہو گا۔

(۲) عوامی توقعات پوری ہوتی نظر نہیں آتیں۔ حکومت نے جو اصلاحات کی ہیں وہ برائے نام ہیں۔ حکومت نے یعنی پارٹی نے جو وعدے کئے تھے۔ وہ بُری طرح کچلے گئے ہیں۔ اصلاحات کے نام کی توہین کی گئی ہے۔ لیبر اور زرعی اصلاحات میں چھوٹے طبقہ کو کچلا گیا ہے۔ تعلیمی اصلاحات بھی کچھ اتنی اچھی نہیں۔ عوام کو توقع تھی کہ بھٹو کے برسرِاقتدار آنے سے وہ سکھ کا سانس لیں گے۔ غربت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ سفارش کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ مہنگائی دم توڑ جائے گی۔ مزدور کی انا کو دبایا نہیں جائے گا۔ مزارع جاگیردار کے ظلم و ستم سے نکل جائے گا۔ لیکن ہوا کیا۔ تمام مندرجہ بالا برائیاں اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ حکومت اس کا الزام سرمایہ داروں جاگیرداروں یا بیورو کریٹوں کو دیتی ہے کہ یہ حالات کی خرابی کے ذمہ دار ہیں۔ میں مانتا ہوں، تسلیم کر لیتا ہوں تو پھر میں اپنی پارٹی کے برسرِاقتدار افراد سے سوال کرتا ہوں کہ آپ کی حکومت کا کیا فائدہ ہے۔ اگر آپ ان لوگوں کو کنٹرول نہیں کر سکتے، یا کنٹرول کرنے کے بعد آپ نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ تو چھوڑ دیں اس جنجال کو کیوں عوام میں بدنام ہوتے ہیں

(۳) بعض حلقوں میں عوامی ذہن رکھنے والے رہنماؤں نے کارکنوں سے رابطہ قائم رکھا ہے۔ اور یہ حضرات کرسی پر ہونے کے باوجود اپنے علاقوں میں پارٹی کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ اور کارکنوں کے ساتھ ان کا رابطہ قائم ہے۔ لیکن ان حلقوں میں خلا پیدا ہو چکا ہے۔ جہاں برسرِاقتدار حضرات عوامی نہیں ہیں۔ بلکہ صرف ٹکٹ کی خاطر پارٹی میں تشریف لائے تھے۔ ایم پی اے اور ایم این اے بھی کارکنوں سے رابطہ توڑ چکے ہیں۔ میرے علاقہ میں ایک ایم پی اے پارٹی یونٹ کے چیئرمین ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ لیکن ان کا لوگوں سے رابطہ تو درکنار کارکنوں سے بھی ختم ہو چکا ہے۔ جہاں تک مرکز کا تعلق ہے۔ مرکزی سیکرٹریٹ کا رابطہ بھی قومی و صوبائی اسمبلیوں کے ممبران سے رہ گیا ہے اور کارکنوں کو بھلایا جا چکا ہے۔

(۴) جہاں تک آپ کے اِس سوال کا تعلق ہے۔ اِس کا جواب

زیادہ تر آپ کے سوال نمبر ۲ کے جواب میں نظر آرہا ہے۔ صرف دو یا تین ارکان ایسے ہیں جو عہدوں پر جانے کے باوجود اپنے آپ کو کارکنوں کا خادم سمجھتے ہیں اور اکثریت ایسی ہے۔ جو کارکن کے لفظ سے بھی نفرت کرتی ہے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ پاکستان میں کارکن کی کوئی عزت نہیں ہے۔ حالانکہ یہی لوگ پارٹی کے معمار ہوتے ہیں۔

(۵) اتحاد و تنظیم کے لئے میری پہلی تجویز یہ ہے کہ پارٹی کے ایسے تمام لوگ جو اسمبلیوں کے ممبر ہیں یا سرکاری عہدے دار بن چکے ہیں۔ وہ پارٹی کے عہدوں سے الگ ہو جائیں۔ کیونکہ جب تک وہ پارٹی کے عہدے دار رہیں گے۔ پارٹی میں دو گروپ بنتے جائیں گے۔ اور مفاد پرست موقع شناس لوگ ان عہدیداروں کا ساتھ دیں گے یا ان کی وجہ سے پارٹی میں آئیں گے۔ اور مخلص طبقہ ختم ہوتا جائیگا یا مقابلہ کرے گا اور گروہ بندی ہوگی۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد آنے والے کسی شخص کو پارٹی کا عہدہ نہ دیا جائے۔ تاکہ مخلص کارکن آگے آسکیں۔ کارکنوں کو بھی چاہیئے کہ وہ آپس میں عہدوں کے لئے نہ جھگڑیں عہدہ دراصل ایک بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر انہیں کوئی اپنے سے ذہین شخص نظر آئے تو اُسے آگے آنے دیا جائے۔ میں خود اس ماہ اپنے عہدہ سے الگ ہو رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے جنرل سیکرٹری کے عہدہ کے لئے مجھ سے ذہین شخص مل گیا ہے۔ قربانی و ایثار کا جذبہ پیدا کیا جائے جو کام بھی کیا جائے مشترکہ مشورہ سے کیا جائے۔

(۶) پیپلز پارٹی کے بااثر افراد نے پارٹی کے نام پر کمائی شروع کر دی ہے۔ مختلف یونٹوں (سیالکوٹ) کے سیکرٹریوں اور چیئرمینوں نے آٹے کے ڈپو حاصل کر لئے ہیں۔ یا ان میں حصے رکھ لئے ہیں۔ سیالکوٹ شہر کے ایک عہدیدار نے اپنے قریبی آدمیوں کے نام سے ڈپو حاصل کئے ہیں اور ان کو برائے نام ڈپو ہولڈر رکھا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں لکھتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ بعض ارکان نے صنعتکاروں کو ساتھ ملا کر ان سے ماہانہ وظیفے لینے شروع کر دیے ہیں۔ ان صنعت کاروں نے اس وظیفہ کے عوض اپنے مزدوروں کا ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ پولیس اسٹیشن پر جاکر پولیس کے عملے سے تعاون شروع کر دیا ہے۔ اور وہی رول ادا کیا ہے۔ جو کبھی کنونشن لیگی کیا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ کمائی کے کئی ذریعے بنا لئے گئے ہیں۔

(۷) میرے خیال میں پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے اور ان تمام افراد کو جو پارٹی کے عہدے دار ہیں۔ سوشلسٹ ملکوں کی طرح حکومتی عہدوں سے الگ ہو جانا چاہیئے چنانچہ اس طرح جو لوگ اوپر جائیں گے۔ ان کو پارٹی کا خوف رہے گا اور وہ اپنے منشور سے روگردانی کرنے کی جرأت نہیں کر سکیں گے۔

(۸) پیپلز پارٹی کے عہدیداران اور کارکنان نے سیالکوٹ کے علاقہ میں ہر سرکاری ادارے میں مداخلت کی ہے۔ سیالکوٹ چھاؤنی کے کنٹونمنٹ بورڈ میں پچھلے دنوں ایک اعلیٰ آفیسر آئے تو پارٹی کے کارکنوں نے ان کی ناجائز توہین کی۔ بعد ازاں میں نے جا کر ان سے معذرت کی۔ چھاؤنی کے سی۔ او۔ ج کو اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کو کہا گیا۔

پیپلز پارٹی کی

جاگیردارانہ قیادت

استحصالی نظام کا

خاتمہ نہیں چاہتی

اسلم اعوان۔ سابق چیئرمین
پیپلز پارٹی - لودھراں

(۱) میں کبھی کسی طرح خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہا، بلکہ میرا ایمان تھا کہ پیپلز پارٹی کی "جاگیردارانہ قیادت" اپنا "اصلی رنگ" ضرور دکھائے گی۔ چنانچہ وہی کچھ ہوا کہ برسر اقتدار آتے ہی حکومت سازی میں تمام جاگیرداروں کو کھپایا گیا یا اسی مزاج کے موقعہ پرست اور خوشامدیوں کو حکومت میں بھر دیا گیا اور اگر کسی نے پارٹی کے منشور کی یاد دلائی یا پارٹی کو جمہوری طرز پر منظم کرنے کا مطالبہ کیا تو اُسے نہ صرف پارٹی کا غدار کہا گیا بلکہ اس پر جلاؤ اور گھیراؤ کا الزام عاید کر کے پارٹی سے نکال دیا گیا۔ مختار رانا کی طرح لوہے کی سنگین سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا اور غالباً اس طرح یہ سوچا گیا کہ "انقلاب" "مر" جائے گا۔ حالانکہ "انقلاب" "کبھی نہیں مرتا" "جدوجہد" لازوال ہے۔

(۲) موجودہ بلکہ نہایت ہی "بےہودہ" "نظام کے تحت پیپلز پارٹی تو کیا اگر آسمان سے کوئی "اوتار" بھی اتر آئے تو عوامی توقعات پوری نہیں کر سکتا۔ کیونکہ عوام کی تمام پریشانیوں، بے انصافیوں اور دکھوں کا اصل سبب یہ نظام ہے۔ جب تک یہ نظام زندہ ہے۔ عوام کی پریشانیاں اور بڑھیں گی۔ ظاہر ہے ان کی توقعات میں بھی اضافہ ہوگا اور جہاں تک ہم نے معلومات حاصل کی ہے۔ پیپلز پارٹی کی جاگیردارانہ قیادت اس نظام کو بدلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔

(۳) پیپلز پارٹی کی قیادت اور کارکنوں میں باضابطہ رابطہ نہ کبھی پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ "پارٹی چند گنے چنے افراد" کے ارد گرد گھومتی رہی بلکہ کارکنوں کو جان بوجھ کر اس طرح گھمایا گیا۔ کیونکہ اگر کارکنوں کا باضابطہ طور پر رابطہ قائم کر دیا جاتا تو شاید پارٹی کے جاگیرداروں کو اتنی آسانی کے ساتھ پارٹی کی قیادت اور یہ وزارتیں نہ ملتیں۔

(۴) پارٹی کے سرکاری عہدوں پر پہنچنے والے رہنماؤں کے رویے میں تبدیلی حیرت انگیز نہیں ہے۔ وہ اپنی ابن الوقتی اور موقع پرستی کا ثبوت دیکر عوام میں ننگے ہوتے جا رہے ہیں۔

(۵) پارٹی کے دیانت دار کارکنوں کو طبقاتی طور پر منظم کرنے کا اب ایک ہی طریقہ ہے۔ تمام گندے انڈے ایک ٹوکری میں بند ہوتے جا رہے ہیں۔ صاف اور ستھرے دودھ کی پہچان کر کے اس کی حمایت میں ہر جگہ طبقاتی تنظیم کو منظم کرنا چاہیئے۔

(۶) پارٹی کے بااثر افراد تو درکنار بعض معمولی اثر رکھنے والوں نے بھی اپنی گزر اوقات کا ذریعہ پیپلز پارٹی ہی کو بنا لیا ہے۔ دیانت دار کارکنوں کو چھوڑ کر بعض "محلے" کے عہدے داروں نے چینی اور آٹا بلیک کر کے بھی اپنے "روٹی پانی" کا بندوبست کرتے رہے ہیں۔

(۷) "سرمایہ دارانہ جمہوریت" ہو یا "عوامی آمریت" ہر جگہ ہمیشہ پارٹی کو حکومت پر برتری حاصل رہی ہے۔ دراصل پارٹی کی پالیسیوں اور پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حکومت پر پارٹی کا کنٹرول ہونا نہایت ضروری ہے۔

(۸) نظام وہی ہے۔ نوکر شاہی وہی ہیں۔ وسائل وہی ہیں اس لئے نوکر شاہی کے کاموں میں مداخلت کی نوعیت بھی وہی ہے۔ مداخلت کرنے والے چہرے بدل گئے ہیں۔ پہلے یہ کام اس علاقہ کا اجارہ دار سیاسی دلال کرتا تھا اب تقریباً ہر کوئی پارٹی کی دھونس دیکر کچھ نہ کچھ کرا ہی لیتا ہے۔

رہنماؤں کا رویہ کارکنوں

کے ساتھ معاندانہ ہے

لئیق یوسف زئی آفس سیکرٹری
پیپلز پارٹی حلقہ بہار گنج (کراچی)

(۱) پارٹی کا کردار اب وہ نہیں رہا جو دورِ اقتدار سے قبل تھا۔

(۲) روٹی، کپڑا اور مکان یہ پارٹی

تھا اور اسی نعرے کے سبب مزدور، کسان اور غریب عوام نے پارٹی سے کافی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ فی الوقت یہ توقعات پوری ہوتی نظر نہیں آتیں۔

(۳) پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور قیادت میں ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے اور کوئی رابطہ باقی نہیں۔ اس کا اندازہ سنٹرل سیکرٹریٹ کے گھیراؤ سے لگایا جا سکتا ہے۔

(۴) سرکاری عہدوں پر جانے والے پارٹی کے رہنماؤں کا رویہ کارکنوں کے ساتھ معاندانہ ہے۔ وہ عوام اور کارکنوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

(۵) کارکنوں کے اتحاد اور تنظیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ پارٹی کے منشور پر کام کریں اور دوسروں کو بھی اس پر چلنے کی تلقین کریں۔ کسی کے ناجائز دباؤ یا دھمکیوں سے دب کر اصولوں پر سودے بازی نہ کریں۔

(۶) ہمارے علاقے میں عبداللہ بلوچ صاحب نے ایک متوازی دفتر پہاڑ گنج جورنگی میں کھلوایا۔ جس میں وہ تمام لوگ عہدے دار ہیں جو دو تین ماہ قبل تک کنونشن مسلم لیگ کا پرچار کرتے تھے اور جنہوں نے گورنمنٹ کی زمین فروخت کر کے لاکھوں روپیہ کمایا۔ کے۔ڈی۔اے کے مقدمے میں ملوث رہے۔ گرفتار ہوئے۔ اب پھر یہی دھندا پارٹی کی آڑ میں کرنا چاہتے ہیں۔ ان ہی لوگوں میں سے ایک صاحب راشن ڈپو والے ہیں جو رات کی تاریکی میں چینی اور آٹے کی بوریاں نہ جانے کہاں روانہ کرتے ہیں اور راشن کارڈ والوں کو ان کے حصے کی چینی دیتے وقت حیل و حجت کرتے ہیں۔

(۷) پارٹی کو حکومت پر کنٹرول رکھنا چاہیئے۔ یہی طریقہ سوشلزم اور عوامی جمہوریت کا ہے۔

(۸) یہ تاثر غلط ہے۔ ایسا لوگ وہی کر رہے ہیں جو ابن الوقت، خود غرض ہیں اور غیر اصولی طور پر پارٹی میں گھس آئے ہیں۔ یہی لوگ غلط حرکتیں کر کے عوام میں مایوسی پھیلا رہے ہیں پارٹی کو بدنام اور کمزور کر رہے ہیں۔ اگر پارٹی کے پرانے اور مخلص کارکن ان لوگوں کی نشان دہی کرتے ہیں تو ان پر سوشلزم، غنڈہ گردی اور پارٹی کے مفادات سے غداری کا الزام لگایا جاتا ہے۔

مشرقی پاکستان کی خاتون افسانہ نگار اُمِ عمارہ کے ساتھ ایک شام

اِن آنکھوں نے پدما کی ٹریجڈی بھی دیکھی

رؤف شیرازی

دسمبر ۱۹۷۱ء کا آخری ہفتہ تھا ہم سب کے دل مشرقی بنگال میں جانکیہ کے پرستاروں کی توسیع پسندی سے مغموم تھے۔ ہر ایک دل اپنے دوستوں اور جگر گوشوں کی اطلاع کے لئے ریڈ کراس، ریڈیو اور اخبارات کی طرف لپک رہے تھے۔ اتنے میں ہمارے ایک اردو اخبار نے صفحہ اول پر یہ خبر کسی بیرونی پاکستان دشمن خبر رساں ایجنسی کے توسط سے نمایاں طور پر لگا دی کہ مشرقی بنگال کے شاعر و صحافی صلاح الدین محمد، عوام دوست شاعر و صحافی احسن محمد اشک خاتون افسانہ نگار ام عمارہ جو صلاح الدین محمد کی بہن ہیں۔ سب کے سب قتل کر دیے گئے۔ اس خبر سے ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ یہ انسانوں کے قتل کی خبر نہ تھی علم و ادب، عقل و شعور کے قتل کی خبر تھی۔ یہ تو صحافی اور ادیب تھے۔ وہ ساری زندگی بنگال کے پس منظر و پیش منظر میں اپنا فن تخلیق کرتے رہے۔ مگر آج یہ خبر کس انداز سے اس اخبار کا منہ چڑا رہی ہے۔ آج وہ ہمارے ساتھ ہیں۔ "میں نے کبھی امنگوں اور نئے شعور کے ساتھ پدما کو عبور کیا تھا۔ ڈھاکہ پہلا شہر تھا جس نے مجھے سہارا دیا۔ جس نے آج کی میری زندگی کا یہ نیم سرسبز پودا لہرا دیا ہے۔" اُم عمارہ کا نیا شعور، نیا دکھ اور یہ نیا سانحہ ہمارا مشترکہ حصہ ہے۔ کتنے لاتعداد آنسو ہم نے بہائے تھے۔ ہم جو مشرقی بنگال کے لئے عوام دشمن نہیں تھے۔ ہم نے ہر وقت بنگال کی صحت مند سیاست کا ساتھ دیا تھا۔ ہم نے ہمیشہ بنگالی عوام کے استحصال کے خلاف ان کی آواز میں اپنی آواز شامل کی۔ ہم کبھی بھی ان سے الگ نہیں تھے۔

اُم عمارہ کو رائٹرز گلڈ کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا تھا۔ وہ رائٹرز گلڈ کے اعزازی سیکرٹری جنرل محبوب جمال زبیدی سے رواں بنگالی بول رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بنگالی اکاڈمی (ڈھاکہ) کی کسی ادبی محفل میں بیٹھی ہوئی ہیں اور کسی افسانہ کے کرداروں کے وطن دوست رویوں کا ذکر کر رہی ہیں۔ اُم عمارہ کے چہرے پر جب کبھی کسی بات پہ ہلکی سی مسکراہٹ آتی تو یکایک وہ بنگال کے کسی واقعہ پر ان کا ذہن چلا جاتا اور وہ بے حد سنجیدگی سے کہتیں ——— "اس کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ٹریجیڈی تو کتابوں میں پڑھی تھی۔ پدما کی ٹریجیڈی بھی ان ساری آنکھوں نے دیکھا ہے۔ لوگ پانی تو کجا ہوا کے لیے بھی تڑپتے تھے"۔

مسلم بنگال، مشرقی بنگال اور مشرقی پاکستان ہماری تاریخ کے تین مختلف باب ہیں۔ آخری باب بند ہو چکا ہے لیکن سائنسی تضادات کے سامنے وقت اور عارضی جبر معمولی واقعات ہیں۔ جس خطے نے اس ملک کو بنایا تھا وہ کیسے اس کو بھول سکتا ہے۔ وہ کس اعتماد کے ساتھ یہ کہہ رہی تھیں کہ ہم بنگلہ دیش نہیں آئے تھے۔ ہم لوگ تاریخ کے ایک مخصوص جبر کا شکار تھے۔ پاکستان میں آئے تھے۔ آج اس بنگلہ دیش کو پاکستان میں بدل دو ہم آج ہی پدما کے کنارے پھر آباد ہو جائیں گے۔ وہ کس خوبصورت انداز سے اپنے ان بنگالی بھائیوں اور ساتھیوں کو خراج عقیدت پیش کر رہی تھیں جن کی وجہ سے وہ کلکتہ اور پھر کراچی پہنچ گئیں۔

بنگال وہ نہیں ہے جو آج ہے؛ بنگال وہ نہیں رہے گا جو آج ہے۔ بنگالی عوام شیخ مجیب الرحمٰن اور بھارتی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہتھیار بلند کر چکے ہیں مجیب الرحمٰن کے گھر ہی سے پہلا نعرہ بلند ہوا ہے ——— "چاول سستا کرو، روزگار دو، ہم بھارتی تسلط کا خاتمہ کر دیں گے"۔

ہم سب لوگ بڑے اچھے ماحول میں مشرقی بنگال کے خاتمہ کا تجزیہ کر رہے تھے۔ ہاجرہ مسرور اور اُم عمارہ بڑی اپنائیت کے ساتھ سوال و جواب میں مصروف تھیں جمال زاہدی بنگالی ہیں، اُم عمارہ کے کسی سوال کے جواب میں کہہ رہے تھے ——— "میں بھی اس وقت تک مشرقی بنگال نہیں جاؤں گا جب تک وہ ہماری فیڈرل یا کنفیڈرل جسم کا ایک حصہ نہیں بن جائے گا"۔

ڈاکٹر حنیف فوق سے اُم عمارہ شکایت کر رہی تھیں کہ ——— "ڈاکٹر صاحب آپ تو بنگلہ دیش میں رہنے کے لیے تیار تھے پھر کیوں آپ نے کراچی

باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں

امتیاز بھٹی

خونِ ناحق

دیارِ محنت میں آج صبح جو حادثہ رونما ہوا ہے
عوام یہ کہہ رہے ہیں ستم گری کی یہ انتہا ہے۔
میں اکثر و بیشتر وطن میں مظاہرے روز دیکھتا ہوں. محافظوں کی زندگی کے
یہ امن و انصاف کے محافظ، کہ جن کے سینوں میں دل نہیں ہیں
وہ جن کے جبر و ستم کے چرچے زباں زدِ عام ہو چکے ہیں
جو اپنے حسنِ سلوک کے بل وقار اپنا بھی کو کھو چکے ہیں
ان ہی کی روداد یاد کرکے، یہ سوچتا ہوں
کہ خونِ ناحق بہے گا کب تک ؟
یہ لوکِ شمشیر کے کچوکے، غریب الناس سہے گا کب تک ؟
دیارِ محنت کے باسیوں پہ، پھر آج مشقِ ستم ہوئی ہے !
بلکتے محنت کشوں کے خوں سے
حدودِ سائٹ میں خوف و دہشت کی داستاں پھر رقم ہوئی ہے !
یہ جارحیت یہ جبرِ پیہم، ہر ایک گھر میں بپا ہے ماتم !
یہ بربریت کے خونی منظر جو کوئی دیکھے وہ کانپ اٹھے
ادھر ادھر کی فضا میں ہر سو ہراس جس نے یہ پھیلا دیا ہے
تقدسِ امن چھینتا ہے۔
یہ امن و انصاف کے محافظ
ستم کی رسمیں جگا رہے ہیں، لہو کے چھینٹے اڑا رہے ہیں

یہ کس کا ہے بے گناہ بچہ جو خاک و خون میں نہا گیا ہے
یہ کون سی بدنصیب ماں کا چراغ کوئی بجھا گیا ہے
یہ تاجرِ سیم و زر جسے بھی چاہیں اُسے سزا دیں۔
ہے ہر زمانے میں راج اُن کا
یہ ناتوانوں کو، بے کسوں کو ستا ستا کے رلانے والے
یہ ذبحِ انسانیت کا ناٹک، قدم قدم پر رچانے والے
اندھیر نگری مچانے والے ہیں
یہ محافظ زر معاشرے کی جبیں کا دھبہ اذیتوں کے حرم سرا ہیں
بلاشبہ وقت کے خدا ہیں
اے اس تمدن کے پاسبانوں نہیں ہے زنجیرِ عدل کوئی
کہ جس کو کھینچیں تو روحِ انصاف تڑپ اٹھے۔
تمہارے دکھوں، تمہارے داغوں کو اپنی جھولی میں ڈال کے میں یہاں وہاں دربدر پھر رہا ہوں
کہ کہیں سے علاج شاید، مگر میں ناکام و دل شکستہ تمہاری فریاد لے کے تمہارے ہی پاس آگیا ہوں
تمہی ہو مرہم تمہی دوا ہو تمہا اپنا علاج یارو !
بدلتے حالات کے تقاضے تمہارے ہاتھوں ہی پورے ہوں گے۔
تمہی کرو گے چراغ روشن، جہالت کی ان سیاہیوں میں
وطن میں فکری صداقتوں کے۔ بلند پرچم تمہی کرو گے۔
تمہی سے ہوگی بہار قائم، خزاں کے پالے ہوئے وطن میں
حقوق الناس کا تحفظ تمہاری ہی قوتوں سے ہوگا۔
تمہی ہو ٹوٹے ہوئے دلوں کی لرزتی امید کا سہارا
انہیں سکون و قرار دیدو، جنوں کو کھویا وقار دے دو
بلکتے بچوں، سسکتی ماؤں کی بھوک کا انتظام کردو !
جو بے گناہوں کے خوں سے کھیلے تم ان کا جینا حرام کردو
نظامِ زر کی بساط الٹو۔ بپا عظیم انقلاب کردو۔
قدم قدم پہ جو بہہ رہا ہے تم اس لہو کا حساب کردو۔

میرپور ساکرو

پیپلز پارٹی کو ووٹ دینے کے "جرم" میں اُسے اپنے بیٹے کی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے

نمائندہ الفتح

دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت کرنے کے "جرم" کی سزا تعلقہ میرپور ساکرو کے مظلوم اور عمر رسیدہ ہاری چنڈرو کو اپنے ایک بیٹے کی جان کی صورت میں ادا کرنی پڑی ۔ اور اس کے تین بیٹے ہسپتال میں موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہیں ۔ گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور ، جناب ممتاز علی بھٹو، صوبائی وزیر محمد خان سومرو اور مقامی رکنِ صوبائی اسمبلی بشیر احمد شاہ کی پُر زور سفارشات بھی مقامی حکام ڈپٹی کمشنر، ایس پی ٹھٹھہ اور مختار کار کو اس غریب ہاری خاندان کو تحفظ دینے پر آمادہ نہ کر سکیں ۔ وہ آج بھی گورنر ہاؤس ، سندھ سیکرٹریٹ اور مختار کار کے دفتر کے طواف کر رہا ہے ، انصاف کی بھیک مانگ رہا ہے ، اپنے جینے کا حق طلب کر رہا ہے ۔ لیکن انصاف کے دروازے اس پر بند کر دیئے گئے ہیں ۔ اس استحصالی نظام میں یہ دروازے اسی پر کھلتے ہیں جو حکام کی مٹھی گرم کر دے ۔

تعلقہ میرپور ساکرو ضلع ٹھٹھہ کے دیہہ غلاڈنو کا یہ مظلوم ہاری ۳۰/۳۲ سال سے مقامی وڈیروں غازی خان اور علی خان کی اراضی پر کاشت کرتا تھا ۔ گزشتہ عام انتخابات کے موقع پر اس نے بھی ملک کے دوسرے مظلوم عوام کی طرح پیپلز پارٹی کو ذریعۂ نجات سمجھ کر اس کی بھرپور حمایت کی اور وڈیروں کے خوف سے راتوں کو چھپ چھپ کر پیپلز پارٹی کے لیے کام کیا ۔ جبکہ مقامی وڈیرے پاکستان مسلم لیگ قیوم گروپ کے وڈیرے امیدوار چانڈیو کی حمایت کر رہے تھے ۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت کرنے کی پہلی سزا اسے یہ دی گئی کہ اس کے خاندان کو زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا ۔ اور انہیں ان کے گھروں سے نکال دیا گیا اور اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے پینے کا پانی بھی بند کر دیا ۔ کئی ماہ تک یہ خاندان کھلے میدان میں پڑا رہا ۔ پیپلز پارٹی کے مقامی رکنِ صوبائی اسمبلی جناب بشیر احمد شاہ نے چنڈرو کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی مدد کریں گے ۔ انہوں نے اسے سرکاری زمین پر کنواں کھودنے کی اجازت بھی دے دی تھی ۔ لیکن مقامی وڈیروں نے یہ کنواں بند کر دیا اور اسے جان سے مار دینے کی دھمکیاں دیں ۔ چنڈرو فریاد لے کر مقامی پارٹی کے لیڈروں کے پاس گیا اور پھر محمد خان سومرو کے پاس پہنچا ۔ انہوں نے اس کی درخواست پر ریمارکس لکھ کر ایس پی ٹھٹھہ کو بھیج دی لیکن کوئی کارروائی نہیں کی گئی ۔ اسی دوران اس پر قاتلانہ حملے کی کوشش کی گئی ۔ لیکن دو مقامی زمینداروں حاجی محمد ہاشم اور حاجی عبداللہ نے اس کی جان بچائی ۔ چنڈرو نے گورنر سندھ ممتاز علی بھٹو سے ملاقات کی اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا ۔

GOVERNOR'S SECRETARIAT
GOVERNOR'S HOUSE
KARACHI

No. Dated 1-4/72

To,

The Deputy Commissioner Thatta

I am desired by the Governor of Sind to forward the enclosed petition and to request you to call the petitioner and give him a hearing. If you are unable to accede to his request, please ensure that the reasons are explained to him.

[signature]

Section Officer
for Secretary to Governor, Sind

Copy to: C.M. to

For information

ڈپٹی کمشنر ٹھٹھہ کے نام گورنر سندھ کا خط

گورنر کے پی اے نے ۲ر اپریل کو ڈپٹی کمشنر ٹھٹھہ کو اس کی درخواست بھیج دی ۔ ڈپٹی کمشنر ٹھٹھہ نے وہ درخواست مختار کار میرپور ساکرو کو بھیج دی ۔ اور اس پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی ۔ چنڈرو نے ۱۶ر مئی کو دوبارہ گورنر سندھ جناب میر رسول بخش تالپور سے ملاقات کی ۔ جنہوں نے ڈپٹی کمشنر ٹھٹھہ کو دوبارہ خط لکھا اور حسبِ سابق یہ درخواست مختار کار میرپور ساکرو کے پاس جا کر رُک گئی اور کوئی کارروائی نہیں ہوئی ۔ ۲۳ر جون کو چنڈرو اور اس کے بیٹوں پر مبینہ طور پر قاتلانہ حملہ کیا گیا اور چنڈرو کے ۳۵ سالہ بیٹے موریو کو کلہاڑیوں کے پے درپے وار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ اس کے تین بیٹے ، حسن ، جمعہ اور محمد شدید زخمی ہوئے جو اب اسپتال میں داخل ہیں ۔

ان کے علاوہ اسحاق اور عبداللہ نامی دو افراد بھی زخمی ہوئے ۔ میرپور ساکرو پولیس نے اقدام قتل کے الزام میں وڈیرہ علی خان بھٹو ، محمد حسن ، جمعہ ، نبی بخش ، خیر محمد اور حاجن کو گرفتار کر لیا ہے اور جھگڑے میں چنڈرو خود بھی زخمی ہوا ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ میری اور میرے خاندان والوں کی زندگیاں اب بھی خطرے میں ہے ۔ مجھے اب بھی جان سے مار دینے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں ۔ چنڈرو نے گورنر اور وزیر اعلیٰ سندھ سے اپیل کی ہے کہ وہ اس کی اور

الفتح

اس کے خاندان کی جانوں کی حفاظت کے لیے فوری طور پر مؤثر کارروائی کریں ورنہ اندیشہ ہے کہ حسبِ سابق حکام کی سرد مہری کے نتیجہ میں اس کے خاندان کے مزید افراد قتل کر دیئے جائیں گے۔

ٹنڈو آدم

بیڑی کے ڈھائی لاکھ مزدوروں کا مستقبل تاریک

نمائندہ الفتح

۱۹۶۵ء کی جنگ اور سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بیڑی کے مزدور بے پناہ مصائب و آلام میں مبتلا ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بیڑی کا پتّہ نایاب ہو چکا ہے اور جو پتّہ اسٹاک میں موجود تھا وہ یا تو ختم ہو گیا ہے یا منافع خوروں نے ذخیرہ کر لیا ہے۔ اس کی وجہ سے بیڑی کے مزدوروں میں شدید بے چینی اور اضطراب پھیلا ہُوا ہے۔ بعض کارخانے بند ہو گئے ہیں بعض میں چھانٹی کر دی گئی ہے۔ جن کارخانوں میں پچاس ساٹھ افراد کام کرتے تھے اب نو یا دس مزدور کام کر رہے ہیں۔ بیڑی کی صنعت دن بدن تباہ ہوتی جا رہی ہے اور اس سے وابستہ ڈھائی لاکھ افراد کا مستقبل تاریک ہوتا جا رہا ہے۔

۲۵ جون کو ٹنڈو آدم میں بیڑی ورکرز یونین کا ایک اجلاس منعقد ہُوا جس سے خطاب کرتے ہوئے بیڑی ورکرز یونین کے جنرل سیکرٹری عبدالباقی قریشی نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ڈھائی لاکھ بیڑی کے کاریگروں کی بے روزگاری ختم کرنے اور انہیں فاقہ کشی سے بچانے کے لیے برّی بحری کسٹم کراچی میں ضبط شدہ بیڑی کا پتّہ کارخانے داروں کو مناسب قیمت پر فروخت کر دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ بیڑی ورکرز گزشتہ ۲۴ سال سے معاشی بدحالی، ناانصافی اور استحصال کا شکار ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ حکومت نے آج تک ہمارے مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا اور حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی حال ہی میں وزیر صنعت نے یقین دلایا تھا کہ نئی درآمدی پالیسی میں بیڑی کا پتّہ بھی شامل کیا جائے گا۔ لیکن بیڑی کے پتّے کی درآمد اور اس کی کاشت کے بارے میں ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ بیڑی کے پتّے کی کاشت کا تجربہ کامیاب ہو چکا ہے اس لیے ۲۵ ہزار ایکڑ اراضی پر بیڑی کے پتّے کی کاشت کی جائے تاکہ پتّے کی درآمد کی ضرورت ختم ہو جائے۔

اجلاس میں نبے، کلو اور محمد صدیق نے بھی خطاب کیا۔ انہوں نے کہا کہ بیڑی ورکرز کے مسائل کے سلسلے میں متعدد وفود گورنر سندھ، وزیرِ اعلیٰ سندھ اور متعلقہ صوبائی وزراء سے ملاقات کر چکے ہیں۔ لیکن ان اربابِ اقتدار نے صرف یقین دہانیوں پر اکتفا کیا اور مسائل کو حل کرنے کے لیے کوئی مؤثر اقدام نہیں کیا۔

بنو عاقل

محکمہ جاتی غفلت کی بدترین مثال قائم کردی گئی

نمائندہ الفتح

بجلی کے تاروں میں فٹنگ کی خرابی سے بنو عاقل کے ہیلتھ سنٹر میں بجلی کی سپلائی رُک گئی ہے جس سے مریضوں کو شدید پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بعض مریضوں کا بجلی نہ ہونے کی وجہ سے آپریشن بھی نہیں ہو سکا۔ بتایا جاتا ہے کہ تقریباً ایک ہفتے سے بجلی کے تاروں میں خرابی پیدا ہو گئی ہے جس سے سوائے ایک کمرہ کے، پورے ہسپتال میں بجلی کی سپلائی رُک گئی ہے۔ موسم گرما کی وجہ سے مریضوں کو بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مریضوں کی شکایات پر جب واپڈا کے حکام سے رابطہ قائم کیا گیا تو انہوں نے معائنہ کے بعد اس کی ذمہ داری بنو عاقل کی ٹاؤن کمیٹی پر ڈال دی ادھر ٹاؤن کمیٹی کے عملے نے بھی اپنی معذوری کا اظہار کر دیا محکمہ جاتی غفلت اور عدمِ تعاون کی بدترین مثال ہے جس کی سزا مریضوں کو مل رہی ہے۔

شہر کے سیاسی و سماجی حلقوں نے اس صورتِ حال پر شدید مذمت کا اظہار کرتے ہوئے انتظامیہ کے حکام سے فوری مداخلت کی اپیل کی ہے اور ذمہ دار افراد کے خلاف تادیبی کارروائی کا مطالبہ کیا ہے۔

گجرات

پنکھا بنانے والے پنکھے کی ہوا سے محروم

طارق جاوید چودھری

گجرات پاکستان میں سب سے زیادہ پنکھے بنانے کی انڈسٹری رکھتا ہے۔ بے شمار پنکھے ملک کے ہر گوشے اور مشرق وسطیٰ سپلائی کیے جاتے ہیں۔ مظلوم، فاقہ کش اور محنت کش، دن رات محنت کر کے مال تیار کرتے ہیں، مالک ان کی محنت کا سارا ثمر اپنے عالی شان بنگلوں میں منتقل کرتے ہیں اور مزدور بیچارا پہلے سے بھی زبوں حال ہو جاتا ہے۔ اور اس کی جوانی جلد بڑھاپے کی حدود کو چھونا شروع کر دیتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ پنکھا بنانے والے اتنی سخت گرمی میں پنکھے کی ہوا نہیں لے سکتے۔ اس کی واضح مثال محلہ حیات النبی کا ایک مزدور محمد یونس ہے جو بڑی مشکل سے زندگی میں پہلی بار پنکھا حاصل کر سکا مگر محکمۂ بجلی والوں نے اس پر پنکھے کی ہوا منع کر رکھی ہے۔ محکمۂ بجلی کے عملے کے خوشامدوں، دفتروں کے چکّر کاٹنے کے بعد وہ سیکورٹی جمع کرانے تک پہنچا ہے۔ لیکن کنکشن حاصل کرنے کا آخری مرحلہ اس کے لیے وبالِ جان بن گیا ہے الیکٹریکل ڈیپارٹمنٹ والے سو روپیہ رشوت مانگتے ہیں جو اس کی استطاعت سے باہر ہے۔ وہ ایس ڈی او کے دفتر میں گیا مگر ایس ڈی او نے اس کی بات پر کان نہ دھرے اور اپنے کلرک کے پاس جانے کو کہا جس نے اسے یہ کہہ کر کمرے سے نکال دیا کہ —— "یہاں ہر کام پیسے سے ہوتا ہے۔"

وہ محکمۂ بجلی کے ایکسین سے لے کر شہر کے ہر افسر کو مل چکا ہے مگر کوئی شنوائی نہیں۔ وہ پوچھتا ہے کہ یہ کیسا عوامی دور ہے کہ جس میں ایک مزدور پر بجلی والوں نے ظلم و ستم کی انتہا کر رکھی ہے۔

کتابوں پر تبصرہ

عشق عبث بدنام ہُوا

تبصرہ کیلئے دو کتابیں بھیجنا ضروری ہے

قیمت : آٹھ روپے

مصنف : علی منظر رضوی

یسوع مسیح سے جب کسی نے سوال کیا کہ سچائی کا راستہ کونسا ہے؟ تو یسوع مسیح نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ــــــ "حقیقت کو سمجھنے اور پرکھنے کا راستہ سچائی کا راستہ ہے۔" ــــ اور جب ہم اپنے عہد کی زبان میں حقیقتوں کے اظہار کے کسی لب و لہجہ کو تلاش کرتے ہیں تو ہمیں بے ساختہ علی منظر رضوی صاحب کی کتاب "عشق عبث بدنام ہُوا" میں مِل جاتا ہے۔ یہ تین ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں سچائیوں کے سارے راستے ایک ہی منزل سے گزر رہے ہیں اور وہ منزل یسوع مسیح کی "حقیقت" ہے۔ کرشن چندر کی محبت ہے، رسل کی انسانیت ہے، سارتر کی وجودیت، لینن کا انقلاب ہے، اور علی منظر کے نزدیک متوسط طبقہ کی منافقت اور بورژوا طبقہ کا کھوکھلا پن ہے۔

ان ساری حقیقتوں میں سوچنے والوں کا اپنا ایک شعور ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور آگہی کے ذریعے نئے راستوں کا متلاشی ہے یا پھر پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھ رہا ہے جہاں اسے گئے زمانے کے پُرکشش حالات بلا رہے ہیں۔ فکر کے اس تصادم نے جن راہوں کو روشن کیا ہے اس میں ڈرامے کا فن حقیقت و ابلاغ کے سب سے زیادہ قریب ہے۔

علی منظر رضوی نے جدید عہد کے فکری تقاضوں کے پیچ و خم سے جب حالات کو ڈراموں میں قلم بند کیا ہے وہ ایک ایسے ماحول کی عکاسی کر رہے ہیں جس میں ہم سب ایک دوسرے کو نقابوں سے جھانک رہے ہیں اور جب یہ نقابیں ہٹتی ہیں تو سب ایک دوسرے کو دیکھ کر ندامت محسوس کرتے ہیں جو اس حقیقت کے ساتھ مانندِ کہر غائب ہو جاتی ہے کہ ــــ "جب اس بزم میں سب ہی رسوائیوں میں پل رہے ہیں تو ندامت کے کیا معنی؟ ــــــ" یہ اس دَور کا المیہ ہے، یہ متوسط طبقہ کی منافقت ہے، یہ بورژوا طبقہ کا کھوکھلا پن ہے اور یہ اس سماج کا ہلکا پن ہے جہاں نو دولتیے اپنی احساسِ کمتری میں کن کن سہاروں کی تلاش میں رسوائی کا طوق ڈالے پھر رہے ہیں۔ جب ہم علی منظر کے ڈراموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن گندے راستوں کو انہوں نے قارئین کے سامنے آشکار کیا ہے وہ وہی راستے ہیں جس پر ہمارا موجودہ سماج گامزن ہے اور جس کی بنیاد گندے راستے پر پڑی ہے جنس کی بے راہ روی اگر ایک طرف غیر صحت مندانہ مزاج و ماحول کی عکاسی کرتی ہے تو دوسری طرف اس کے پیچھے معاشرہ کا پورا نقشہ اپنی خامیوں کے ساتھ جلوہ نمائی کر رہے ہیں۔ ہر چند معاشرے نے انسانیت کے فروغ، برائی کے انسداد اور محترم اقدار کے نمو کے لیے

ایک دائمی جد و جہد کی ہے لیکن ان معاشروں میں گندی اور تعفن انسانی نفس کے ساتھ گھل مل جاتی ہے جہاں معاشی انصاف نظر انداز کر کے سرمایہ داروں کے کھوکھلے نظام میں اعلیٰ اقدار کی سعی لاحاصل کی جاتی ہے۔

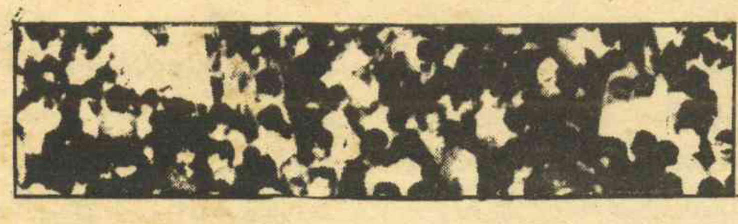
علی منظر کے کسی ڈرامے کو لے لیں، ہمارے عہد کی زبوں حالی اور معاشی ناہمواری کے مسائل جنس اور جنسی کج روی میں ظاہر ہو رہے ہیں ــــــ مثلاً ایک ڈرامے "عشق عبث بدنام ہُوا" میں یوں ہمکلام ہیں: ــــــ

رشید: "لیکن حقیقت یہی ہے۔ حسن و جمال کے متعلق میرا اپنا ایک آدرش ہے۔ اس آدرش کی تلاش میں مَیں نے ایشیا اور یورپ کے حسین ترین شہروں کی خاک چھانی ہے۔ ان شہروں میں مَیں نے ہزاروں لڑکیاں دیکھیں حسین بھی اور جمیل بھی! جن پر مجھے اپنے آئیڈیل کا دھوکہ ہُوا ــــــ" یا پھر ــــــ "گناہ اور ثواب کی منزل ایک ہے۔ مجھے اپنی انگلی پکڑ لینے دو، پھر جو راستہ چاہو اختیار کر لینا۔ ــــــ"

علی منظر کے مکالموں کی برجستگی اپنے ساتھ اس سماج کے ہلکے پن کو کتنی خوبصورتی عیاں کر رہی ہے۔ شوکت صدیقی نے صحیح لکھا ہے کہ منظر علی رضوی کے فن کی نمایاں وصف ان کے مکالمے ہیں۔ برجستہ، برمحل، رواں اور خیال انگیز! ان مکالموں سے وہ اپنے کرداروں کی تعمیر کرتے ہیں، ان میں زندگی کی نمو پیدا کرتے ہیں، انہیں متحرک اور جاندار بناتے ہیں۔ بقول فیض احمد فیض "علی منظر رضوی صاحب نے ہمارے معاشرے کے جس گھناؤنے اور دردناک پہلو کی نقاب کشائی جس انداز سے کی ہے، ان کے مشاہدے کی صحت اور خلوص کا ثبوت بھی ہے۔ اور ایک دردمند دل کی شہادت بھی ــــ" اور جوش صاحب نے یہ الفاظ لکھ کر علی منظر کے ڈراموں کو امر بنا دیا ہے کہ ــــــ "اردو ادب میں فن اور زبان کے اعتبار سے اتنے اچھے ڈرامے اب تک کم لکھے گئے ہیں۔ یہ ڈرامے اردو ادب میں ایک مستقل اور بہترین اضافہ ہیں ــــــ"

علی منظر کے ڈراموں میں امید اور رجائیت کے عناصر جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں اور شاید وہ یہ کہنا چاہتے ہیں ــ

ہمارے عہد کا مقسوم برگِ ریزہ سہی
بہارِ گلشنِ فردا تیری بقا کو سلام
(آغا مسعود حسین)



قارئین کہتے ہیں

ہم صرف انصاف چاہتے ہیں

میرا تعلق ضلع مظفر گڑھ کے ان تین سو بد نصیب گھرانوں سے ہے جو "پنج ند بیراج" کی تکمیل کی وجہ سے گزشتہ ۱۸ سال سے زندگی کے تمام حقوق سے محروم کر دیئے گئے ہیں ۱۹۵۴ء میں حکومتِ پنجاب کی طرف سے نقصان شدہ اراضی کے معاوضے میں تقریباً تین ہزار ایکڑ اراضی عطا ہوئی تھی۔ جس پر بارہ سو افراد گزر بسر کرتے تھے مگر ۱۹۵۶ء میں افسر شاہی کی بددیانتی سے یہ اراضی واپس لے لی گئی اور ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔ ۱۴ سال گزر جانے کے باوجود یہ مقدمہ ابھی تک پنجاب سیکرٹریٹ کی الماریوں کی زینت بنا ہوا ہے۔ اس دوران ہر اہلکار اور افسر نے جی بھر کر ہمارا خون چوسا اور اب ہمارے جسم میں اتنا خون بھی باقی نہیں رہا کہ ہم اس مقدمے کا فیصلہ کرا سکیں حالانکہ سب رپورٹیں ہمارے حق میں ہیں۔

ان جاہل اور بد نصیب گھرانوں میں میں واحد تعلیم یافتہ فرد ہوں۔ غربت افلاس اور نامساعد حالات کا مقابلہ کر کے اپنی تعلیم مکمل کی ہے مگر میرا جو حشر ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ میرے ضلع میں تین کالج، درجنوں ہائی سکول، سینکڑوں پرائمری سکول اور مڈل سکول موجود ہیں۔ مگر مقامی ہونے کے جرم میں اور زیادہ ڈگریاں رکھنے کی پاداش میں مجھے اپنے علاقے سے محروم کر کے کراچی دھکیل دیا گیا ہے۔ جہاں محنت مزدوری کر کے دو وقت کی روٹی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہا ہوں۔ ترقی یافتہ علاقوں کے امیدواروں کے مقابلے میں اہلیت تو نہیں رکھتا ہوں مگر میرا تعلیمی ریکارڈ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) میٹرک تھرڈ ڈویژن ۱۹۵۶ء
(۲) انٹرمیڈیٹ سیکنڈ ڈویژن ۱۹۵۸ء
(۳) بی اے سیکنڈ ڈویژن ۱۹۶۰ء
(۴) بی ایڈ سیکنڈ ڈویژن ۱۹۶۳ء
(۵) ایل ایل بی سیکنڈ ڈویژن ۱۹۶۵ء
(۶) ایم۔ اے سیاسیات سیکنڈ ڈویژن ۱۹۶۷ء
(۷) ایم۔ اے اسلامیات فرسٹ ڈویژن ۱۹۶۹ء
(۸) تدریسی تجربہ — ۸ سال اور اب پی ایچ ڈی کا طالب علم ہوں۔

یوں تو میرے پاس ناانصافیوں کے طویل اعداد و شمار موجود ہیں مگر چند مثالوں پہ اکتفا کر رہا ہوں۔

(۱) ۲۴ جولائی ۱۹۶۹ء کو سابقہ مغربی پاکستان پبلک سروس کمیشن نے کراچی میں ویسٹ پاکستان ایجوکیشنل سروس گریڈ II (ہیڈ ماسٹر، ڈسٹرکٹ، ڈپٹی انسپکٹرز) کی اسامیوں کے لیے انٹرویو لیا تھا۔ جس کا مجھے ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں دیا گیا۔ مانا کہ میں سلیکشن کے "فارمولے" میں نہیں آیا ہوں گا مگر نتیجہ حاصل کرنا میرا قانونی حق ہے۔

(۲) ۷ مئی ۱۹۷۰ء کو دوبارہ مذکورہ بالا کمیشن کے سامنے لیکچرز کی اسامیوں کے لیے پیش ہوا مگر جواب

خان عبدالولی خان کا انٹرویو

کینیڈا کے انقلابی ماہنامہ "پاکستان فورم" کے مدیر ڈاکٹر فیروز احمد نے ایک اخباری بیان میں اس بات کی تردید کی ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی کے صدر ولی خان سے انٹرویو لینے کا مقصد مزدور کسان پارٹی کے رہنما جناب افضل بنگش اور اسحاق محمد پر کیچڑ اچھالنا تھا۔

یاد رہے کہ ڈاکٹر فیروز احمد نے خان عبدالولی خان سے جو انٹرویو لیا تھا وہ "الفتح" میں شائع ہو چکا ہے۔ اس انٹرویو میں ولی خان نے مزدور کسان پارٹی کے رہنماؤں افضل بنگش اور اسحاق محمد پر الزام لگایا تھا کہ وہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے تنخواہ دار ایجنٹ ہیں اور کسانوں میں بے چینی اور اضطراب پھیلا کر نیپ کی سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر فیروز احمد نے اپنے اخباری بیان میں کہا ہے کہ انٹرویو میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ ولی خان کے خیالات ہیں اور ان کا کام صرف انٹرویو لینا تھا۔ انہوں نے مزید کہا ہے کہ ان کے دل میں مزدور کسان پارٹی کے رہنماؤں کے لیے بڑی عزت ہے اور اگر ان کے انٹرویو سے ان رہنماؤں کے احساسات مجروح ہوئے ہوں تو وہ ان سے معذرت خواہ ہیں۔

"الفتح" کے سالنامہ میں نیپ کے سربراہ خان عبدالولی خان کے انٹرویو میں مزدور کسان پارٹی کے رہنماؤں سے متعلق جو کلمات چھپے ہیں ان کی اشاعت سے ہمارا مقصد مزدور کسان پارٹی کے رہنماؤں کی ذات پر کیچڑ اچھالنا نہیں تھا۔ تاہم اس سے مزدور کسان پارٹی کے کسی رہنما یا کارکن یا "الفتح" کے قارئین کو دکھ پہنچا ہو تو ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

ندارد !

(۳) ستمبر ۱۹۷۱ء میں ڈائریکٹریٹ ایجوکیشن لاہور میں لیکچرز کا انٹرویو دیا مگر یہاں بھی دولت اور اقربا پروری غالب آئی۔ ایک سو بیس اسامیوں میں سے ایک اسامی بھی اس بدنصیب ضلع کو میسّر نہ آسکی۔ اور بدنام زمانہ کوٹہ سسٹم کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ اس کے خلاف سیکرٹری تعلیمات اور ڈائرکٹر لاہور ریجن کی توجہ مبذول کرائی گئی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

(۴) ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۱ء میں ملتان سیکنڈری بورڈ میں اسسٹنٹ سیکرٹری کی اسامیوں کے لیے درخواست دی گئی۔ اسامیاں پُر کردی گئیں مگر مجھے انٹرویو تک کے لیے نہیں بلایا گیا۔

اس کے علاوہ ہمارے علاقے کے ساتھ ہونے والی عام ناانصافیاں اور دھاندلیاں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) غلط ڈومیسائل کا اجرا ہماری حق تلفی کا باعث ہے جو قانوناً جرم ہے۔ مگر اس قانون کی دھجیاں اڑا کر ہماری سیٹوں پر قبضہ کرانے کے لیے "ہاجی خدید" کہا جاتا ہے۔

(۲) ون یونٹ کی تنسیخ کے بعد زائد عملہ کی سزا بھی ہمیں مل رہی ہے۔ اس کی آڑ میں ہم پر ملازمتوں کے دروازے بند ہیں۔

(۳) پبلک سروس کمیشن کی اسامیوں کی اطلاع تاخیر سے دی جاتی ہے تاکہ اپنے "پسندیدہ" لوگوں کو تجربے کی بناء پر پسماندہ علاقے کے امیدواروں پر سبقت حاصل ہو اور زیادہ تجربہ حاصل ہونے کی صورت میں لیکچرار ایسوسی ایشن سے ان کو مستقل کرانے کا مطالبہ کرایا جائے۔

تلاش گمشدہ

کراچی - ۲ جولائی - پچاس سالہ خاتون جن کا دماغی توازن خراب ہے۔ جن کا نام زینب بی بی ہے۔ لیکن وہ اپنا نام صحیح نہیں بتا سکتی ہیں۔ ان کے بال سفید ہیں۔ جن پر مہندی لگی ہوئی ہے۔ جن صاحب کو ملیں یا کوئی دیکھے تو محمود آباد نمبر ۵، گلی نمبر ۱۵، مکی مسجد ٹھیکیدار محمد اسحٰق کو اطلاع دیں۔ یا ہفت روزہ الفتح - ۲۰ ڈی، نرسری کمرشل ایریا - پی۔ ای سی۔ ایچ۔ ایس۔ کراچی۔ ۲۹ - ٹیلی فون ۴۳۱۲۲۷ پر اطلاع دے کر شکریہ کا موقع دیں۔

(۵) جو پسماندہ علاقوں کے امیدوار اپنی عمروں کی آخری حد تک پہنچ گئے ہیں، تاخیر پیدا کرکے ان کو قانونی طور پر نااہل قرار دیا جائے۔ اور نئے آنے والے ناتجربہ کار امیدواروں کا آسانی سے مقابلہ کیا جائے۔

آخر میں جناب گورنر صاحب پنجاب سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہمارے معاملات پر ہمدردانہ غور فرماکر مرتکب بددیانت افسروں کو سخت سزائیں دیں ہم صرف انصاف، انصاف .... اور انصاف چاہتے ہیں!

(ملک محمد اکبر —— کراچی)

بقیہ: نیپ کی مزدور دشمنی

باری رہنے کی صورت میں دو صورتیں نکلتیں۔ پیپلز پارٹی اقتدار سے دستبردار ہو جاتی یا پھر مزدوروں کی تحریک کو مکمل طور پر کچل دیا جاتا۔

• دونوں صورتوں میں نیپ کو سیاسی فائدہ پہنچتا۔ مزدور قیادت نیپ اور پیپلز پارٹی دونوں کی مزدور دشمنی اور سازشوں سے واقف تھی: چنانچہ اس نے پختہ سیاسی اور طبقاتی شعور کا مظاہرہ کرتے ہوئے دس روز کے بعد ہڑتال کے خاتمے کا اعلان کردیا۔ —— ظاہر ہے کہ یہ مزدوروں کی آخری لڑائی نہ تھی۔ جو لوگ اس ہڑتال سے اپنی سیاست کی دکان چمکانے کی فکر میں تھے یا وہ لوگ جو دس روزہ ہڑتال کو بندوق کی نالی سے پھوٹنے والے انقلاب میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اس کامیاب ہڑتال کے وقتی خاتمہ سے یقیناً مایوسی ہوئی ہے لیکن وہ لوگ جو اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی ہڑتال کے خاتمہ کے اعلان سے مزدور تحریک ختم نہیں ہوتی بلکہ طبقاتی بنیاد پر پہلے سے سنبھل کر آگے بڑھنے کے لیے شروع ہوتی ہے۔ وہ یقیناً مایوس نہیں ہیں۔ وہ مستقبل کی پرولتاری تحریک کی ولولہ انگیز قیادت سے پُرامید ہیں۔

بقیہ: امریکہ میں شیطان کی پوجا

مرنے کے بعد ان کی زندگی ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گی۔ فلوریڈا کی ایک کروڑپتی عورت سیبل لیک دیچ کرافٹ پر زبردست عقیدہ رکھتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ

"یہ ایک صاف ستھرا مذہب ہے۔ البتہ کچھ لوگ اسے ذاتی مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔"

اوکلسٹو کا کہنا ہے کہ انہیں خفیہ اور روحانی طریقہ سے رہنمائی کی جاتی ہے۔ ان پر آسمانوں اور زمینوں کے اسرار ظاہر کئے جاتے ہیں۔

دیچ کرافٹ کے متعلق اب تک جتنے واقعات جمع کئے گئے ان سے پتہ چلتا ہے۔ اس عقیدے کے ماننے والے نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ اجتماعی زندگی کی برائیاں انہیں ٹھوس حقائق سے آنکھیں چرانے پر مجبور کردیتی ہیں۔ وہ ذہنی آسودگی اور کائنات میں ایک اہم اور بااختیار مقام حاصل کرنے کے لئے جادو اور ٹوٹکے کا سہارا لیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں مزید خرابیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ امریکہ ایک زوال پذیر معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس معاشرے میں بالخصوص نئی نسل پریشانی اور شکستہ دلی کا شکار رہے۔ نوجوان نسل میں جادو ٹوٹکے کی مقبولیت اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ امریکہ کی دم توڑتی تہذیب اپنے گلے پر اپنے ہی ہاتھوں سے ایک اور گہرا زخم لگا رہی ہے۔

بقیہ: اُمِّ عمارہ

یونیورسٹی میں ملازمت کرلی؟"

میں نے بھی ایک سوال کیا تھا کہ ہم کس حد تک اس سانحہ کے ذمہ دار ہیں؟ ہم نے کس حد تک محب وطن، عوام دوست اور ترقی پسند طاقتوں کا ساتھ دیا تھا؟

اتنے میں عالی جی کھدر کا کرتہ پہنے داخل ہوتے ہیں۔ آتے ہی اپنے مخصوص انداز کے ساتھ بول پڑتے ہیں —— "ارے ہماری بہن دکھی ہے، بہت دکھی —— !"

اُمِّ عمارہ صوبائی تعصب اور نفرت کا شکار بنی ہم میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ یہاں کے ادیب شاعر اور دانشور اُمِّ عمارہ کے دکھ درد کو اپنا ہی دکھ درد سمجھ کر بات چیت کر رہے ہیں۔

بقیہ: اداریہ

ہیں۔ مشرقی پاکستان کے مزدور کسان۔ نے مسلح جدوجہد کا آغاز کر دیا ہے لہٰذا وہ بنگلہ دیش کی تحریک آزادی کو بھارتیوں اور روسیوں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیں گے۔ اس کے برعکس وہ مغربی پاکستان میں مسلح عوامی فوج قائم کریں گے —— ہر آدمی کے پاس ایک بندوق —— ہر آدمی اپنے وطن کا مسلح محافظ —— !

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
6 - 13 - JULY. 1972